ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

HRCP

جلد نمبر 27......شمارہ نمبر 02 ...... فروری 2020 (قیمت 10 روپے)

Monthly JUHD-E-HAQ - February-2020 - Registered No. CPL-13

جب حق بات کہنا بغاوت ٹھہرے

31 جنوری 2020، ملتان: جنوبی پنجاب میں مزدوروں کے حقوق کا کنونشن

انسانی حقوق کا عالمی دن

فروری

4 فروری	کینسر کا عالمی دن
6 فروری	خواتین کے تولیدی اعضاء کو کاٹنے کی ممانعت کا عالمی دن
13 فروری	ریڈیو کا عالمی دن (یونیسکو)
20 فروری	سماجی انصاف کا عالمی دن
21 فروری	مادری زبان کا عالمی دن (یونیسکو)

فہرست

پریس ریلیزیں	03
منظور پشتین کی گرفتاری کے خلاف احتجاج	05
یہ ملک آخر کون چلا رہا ہے بھئی؟	07
خواتین کو اپنے حقوق کشکول میں مانگنے کی ضرورت نہیں	08
نیب قانون میں بنیادی تبدیلیاں ہی واحد چارہ ہے	09
بارھویں عالمی اردو کانفرنس 2019	10
سزائے موت کے منتظر بچے	12
ریاستی تشدد: ایک طاعون	18
پاکستانی جیلوں میں قیدی اور نظام انصاف	19
لڑکی کو تعلیم دینا قوم کو تعلیم دینے کے مترادف ہے	20
جاؤ اسے ڈیجیٹل زندان میں ڈال دو	21
پاکستان کنفیوژن میں ہے کیونکہ پیدا ہی پیدا ہی کنفیوژن میں ہوا	22

اسلام آباد میں کارکنوں کی گرفتاری غیر آئینی ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اسلام آبادی میں کم از کم 23 سول سوسائٹی اور سیاسی کارکنان کی گرفتاری کی شدید مذمت کی ہے جنہیں کل اسلام آباد میں ایک پرامن احتجاج میں گرفتار کیا گیا اور کمشین نے شہری حقوق کے کارکن منظور پشتین کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس چ؟ ز کے کوئی شواہد نہیں کہ مظاہرین تشدد کی طرف مائل ہوئے تھے، البتہ ویڈیو فوٹیج ان میں سے کئی کے ساتھ پولیس کی بدسلوکی کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔

ایچ آر سی پی کے خیال میں یہ اقدامات غیر آئینی ہیں اور شہریوں کی آزادیِ اظہار اور پُرامن اجتماع کے حق کے منافی ہیں۔ سیاسی اختلاف رائے جس نے کسی بھی طرح سے نفرت یا اشتعال کی ترغیب نہیں دی، کو دبانے کے لیے ایک فرسودہ قانون کے تحت بغاوت کے الزامات کے بے جا استعمال سے معلوم ہو گیا ہے کہ ریاست کی نظر میں اپنے شہریوں کے سول و سیاسی حقوق کی اہمیت کس حد تک کم ہے۔ یہ امر باعثِ تشویش ہے: ریاست کا یہ اقدام اُن شہریوں کے ساتھ اُس کے سلوک کی عکاسی کرتا ہے جنہوں نے اُس کی پالیسیوں سے پُرامن اختلاف کا راستہ اپنایا۔

ایچ آر سی پی عمار رشید، نوفل سلیمی، سیف اللہ نصر اور شاہ رخ عالم سمیت تمام قید کیے گئے افراد کی فی الفور اور غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم حکام سے یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کے پُرامن مظاہروں سے نبٹتے وقت طاقت کے بے جا استعمال سے پرہیز کیا کریں۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 29 جنوری 2020]

پاکستان کے شہریوں کی حاکمیت کہاں ہے؟

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے آئین کی سربلندی اور انسانی حقوق کے عنوان پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس میں انسانی حقوق کے ممتاز کارکنوں نے پاکستان میں جمہوریت کی ترقی کے لیے مناسب لائحہ عمل پر سوچ بچار کیا۔

سیمینار کے مقررین میں ایچ آر سی پی کے اعزازی ترجمان آئی۔اے۔رحمان، ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق، ایچ آر سی پی کی کونسل رکن اور عدالتِ عظمیٰ کی وکیل حنا جیلانی، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری جنرل ناصر زیدی، پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پارلیمنٹری سروسز کے سابق ڈائریکٹر ظفر اللہ خان ; سابق سینیٹر افراسیاب خٹک، فرحت اللہ بابر اور تاج حیدر; جسٹس (ریٹائرڈ) شکیل بلوچ، سینئر صحافی محمد ضیاء الدین، حامد میر اور عاصمہ شیرازی، سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکریٹری جنرل شمیم ملک اور سیاسی کارکن ڈاکٹر عاصم سجاد اختر شامل تھے۔

سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے سیمینار میں شرکت کی۔ سیمینار میں منظور ہونے والی قرارداد میں سیاسی قیادت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پارلیمان کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور عوام کی بنیادی آزادیوں و حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ منتخب نمائندوں کو یہ بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ملک کا نظم و نسق حکم ناموں کی بجائے ملک کے رائج قوانین اور

آئینی اقدار کی رُو سے چلے۔

قرارداد میں اس امر کا مشاہدہ بھی کیا گیا کہ غیر جمہوری قوتوں کی طرف سے سیاسی انجینئرنگ نے جمہوری عمل کو کس طرح نقصان پہنچایا ہے اور پسند ناپسند کی بنیاد پر جوابدہی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں، خاص طور پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اقدامات کو قانون کے دائرے میں لایا جائے اور اُن کی کارروائیوں پر مضبوط، آزاد پارلیمانی نگرانی کا نظام لاگو کیا جائے۔

قرارداد کے مطابق، خیبر پختونخوا کے قبائلی اضلاع میں پولیس کے فرائض و ذمہ داریاں قانون کے نفاذ کے سویلین اداروں کو سونپی جائیں۔ کے پی میں حراستی مراکز کا ظالمانہ نظام بھی ختم کیا جائے۔

ایچ آر سی پی کا ہمیشہ سے حکومت کا مطالبہ رہا ہے کہ جبری گمشدگیوں کو جبری گمشدگیوں کے عالمی میثاق کی روشنی میں جرم قرار دیا جائے اور جبری گمشدگیوں پر قائم ہونے والے انکوائری کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر لائی جائے۔

مقررین کا کہنا تھا کہ پاکستان کے نوجوان جنہیں کئی دہائیوں سے ملکی معاملات سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے اور جو اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر آنے پر مجبور ہوئے، اُن کے خلاف فوجداری مقدمے بنانے کی بجائے اُن کی بات سُنی جائے۔ انسانی حقوق کے دفاع کاروں اور صحافیوں کو اُن کا کام کرنے دیا جائے اور جہاں تنقید کی ضرورت ہو تنقید کرنے کی اجازت دی جائے۔

اگر پاکستان میں جمہوریت کی ترقی کو یقینی بنانا ہے تو پھر ریاست کو وفاق کی تمام اکائیوں میں مقامی حکومتوں کا خودمختار اور آزاد نظام تشکیل دینا ہوگا۔ ریاست کو عدلیہ پر عوام کا اعتماد بحال کرنا ہوگا یہ پیغام دے کر کہ آئین توڑنے والوں کو جوابدہ ٹھہرایا جائے گا۔ ایچ آر سی پی پُر اُمید ہے کہ عدالتِ عظمیٰ لاہور ہائی کورٹ کے رُجعت پسند فیصلے کو کالعدم قرار دے گی۔ ریاست کو اٹھارہویں ترمیم اور قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کے تحت صوبائی خودمختاری کو بھی تحفظ دینا چاہیے۔ صوبائی خودمختاری پاکستان کی وفاقی اکائیوں کا جمہوری حق ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 14 جنوری 2020]

پارلیمان کو آرمی ایکٹ پر قانون سازی میں غیر ضروری عجلت سے گریز کرنا چاہیے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو اِس امر پر تشویش ہے کہ پارلیمان ابھی حال ہی میں ایوان میں متعارف کیے گئے پاکستان آرمی (ترمیمی) ایکٹ 2020، پاکستان نیوی (ترمیمی) ایکٹ اور پاکستان ایئر فورس (ترمیمی) ایکٹ کے ذریعے فوج کے تنظیمی معاملات میں ردوبدل لانے میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتے نظر آ رہی ہے۔

جمہوری نظم و نسق کے وقار کے تحفظ کی خاطر ضروری ہے کہ مسلح افواج کے سربراہان کی مدت ملازمت اور تقرری کے قواعد و ضوابط سے متعلق فیصلے لینے میں جلدی نہ کی جائے۔ جس غیر ضروری عجلت سے کام لیا جا رہا ہے اِس کے مستقبل میں جمہوری فیصلہ سازی کے طریقہ کار پر شدید منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

افراد پر انحصار کی بجائے اداروں کا استحکام پاکستان میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی قوت پیدا کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ حال ہی میں پیش ہونے والے قوانین مفاد عامہ کا معاملہ ہیں اور عوام کے منتخب نمائندوں کا فرض ہے کہ وہ ذمہ دار لوگوں کی طرح قانون سازی کریں نہ کہ اسے ایک وقتی معاملہ سمجھیں۔ آئین کی روح کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 05 جنوری 2020]

جسٹس (ریٹائرڈ) فخرالدین جی ابراہیم کی وفات: ایک ناقابلِ تلافی نقصان

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو جسٹس (ریٹائرڈ) فخرالدین جی ابراہیم کی وفات کا شدید غم ہے۔ وہ ایچ آر سی پی کے بانی اراکین میں سے تھے اور کمیشن کی پہلی کونسل کے رکن رہے تھے۔ معروف قانون دان اور انسانی حقوق کے دفاع کار کے طور پر، وہ سماج کے سب سے پسے ہوئے طبقوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے عمر بھر کمیشن کے سرگرم حامی رہے تھے۔ یہ وہ ہی تھے جنہوں نے غریب لوگوں کے حقوق کی حفاظت کیلیے مفاد عامہ کی مقدمہ سازی کے عمل کی داغ بیل ڈالی۔

پُرعزم جمہوریت پسند ہونے کی بدولت اُنہوں نے ایچ آر سی پی کے بانی چیئر پرسن مرحوم جسٹس دراب پٹیل کے ہمراہ 1981 میں جنرل ضیاء الحق کے عارضی آئینی آرڈر کے تحت حلف لینے سے انکار کر دیا تھا۔ جسٹس (ریٹائرڈ) ملک کے ممتاز دانشور بھی تھے اور بطور گورنر سندھ اپنی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے شہری۔ پولیس رابطہ کمیٹی (سی پی ایل سی) کی بنیاد ڈالی؛ سی پی ایل سی آج کے دن تک فعال ہے۔ بے داغ وقار کے حامل جسٹس (ریٹائرڈ) فخرالدین نے 2013 کے قومی انتخابات کے دوران چیف الیکشن کمشنر کے طور پر ملک کی خدمت کی۔ انسانی حقوق کے لیے اُن کی عشروں پر محیط جدوجہد کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 07 جنوری 2020]

صفائی ستھرائی پر مامور مزدوروں کے حالات اُنہیں اپنی زندگیاں لینے پر مجبور کر رہے ہیں

پاکستان کمیشن برائے انسانی (ایچ آر سی پی) کو صفائی ستھرائی پر مامور مزدوروں میں خودکشی کی کوششوں کی بڑھتی ہوئی اطلاعات پر تشویش ہے۔ ہمارے ذرائع کا کہنا ہے کہ مزدوروں کو من مانے طریقے سے ملازمت سے نکالنے اور تنخواہوں کی عدم ادائیگی کا سلسلہ کئی ماہ سے جاری و ساری ہے۔ اس کا ملک کی افرادی قوت کے اُس حصے پر شدید منفی اثر پڑ رہا ہے جسے بامعنی مشقت دینے کے باوجود اکثر 'غیر مرئی' تصور کیا جاتا ہے۔

وفاقی و صوبائی حکومتوں اور میونسپل کارپوریشنوں کی ایسے مزدوروں کے ساتھ لاتعلقی قابلِ مذمت ہے جو بدستور پُرخطر حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی ملک بھر میں صفائی پر مامور مزدوروں کی انجمنوں کے ساتھ کام کرنے کا خواہاں ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ اُن کی شکایات سُنی جائیں اور ان کا فوری و منصفانہ ازالہ کیا جائے۔ صفائی کا کام اتنی ہی عزت اور سماجی بہبود کا مستحق ہے جتنا کہ کوئی دوسرا پیشہ ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 19 جنوری 2020]

منظور پشتین کی گرفتاری کے خلاف احتجاج

حراست میں لیے جانے والے نوفل سلیمی، عمار رشید اور محسن ابدالی کون ہیں؟

اسلام آباد کی ایک مقامی عدالت نے پشتون تحفظ موومنٹ کے رہنما منظور پشتین کے گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے پر گرفتار ہونے والے 23 افراد کی ضمانت کی درخواست مسترد کردی ہے۔ گرفتار افراد پر ریاست کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کرتے ہوئے ان کو جمعرات کی صبح جوڈیشل مجسٹریٹ کی عدالت نے 15 روزہ جوڈیشل ریمانڈ دے کر اڈیالہ جیل بھیج دیا تھا۔

28 جنوری کو اسلام آباد میں پریس کلب کے سامنے منظور پشتین کی گرفتاری کے خلاف احتجاجی مظاہرے میں حصہ لینے والے درجنوں افراد کو پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ ان میں قومی اسمبلی کے رکن محسن داوڑ سمیت پی ٹی ایم کے متعدد کارکن، عوامی ورکرز پارٹی کے کارکن اور چند طلبا شامل تھے جبکہ رکن قومی اسمبلی محسن داوڑ کو چند گھنٹوں بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ نامہ نگار شہزاد ملک کے مطابق جمعے کے روز ضمانتوں کی درخواست پر عدالتی کارروائی کے بعد اسلام آباد کے ایڈیشنل سیشن جج محمد سہیل نے اپنے حکم میں کہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد انھیں اس بارے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ ملزمان کے خلاف درج ہونے والے مقدمے میں انسداد دہشت گردی کی دفعہ سات کا بھی اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ اس مقدمے میں گرفتار ہونے والے ملزمان کے وکیل نثار شاہ کا کہنا ہے کہ وہ اس فیصلے کے خلاف اسلام آباد ہائی کورٹ میں اپیل دائر کریں گے۔ مقامی پولیس کا کہنا ہے کہ ایڈیشنل سیشن جج کی رائے کی روشنی میں مشاورت کی جائے گی اور اعلی حکام کو اس ضمن میں آگاہ کیا جائے گا۔

عوامی ورکرز پارٹی کی رکن طوبیٰ سید نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ احتجاجی مظاہرے سے 29 افراد کو گرفتار کیا گیا تھا جبکہ ان میں سے چھ کو بعد ازاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ گرفتار ہونے والے ساتھیوں نے 29 جنوری کی رات مختلف پولیس تھانوں میں گزاری اور اب انھیں جوڈیشل ریمانڈ پر 15 دن کے لیے اڈیالہ جیل بھیج دیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا 'ہمارے ساتھیوں کے خلاف کیس فائل ہونے کے باوجود بھی ان کو ضمانت نہیں دی گئی۔ عدالت مجسٹریٹ کا کہنا ہے کہ یہ میرے دائرہ کار میں نہیں ہے اس لیے میں ان کی ضمانت نہیں دے سکتا۔' ان کا مزید کہنا تھا 'ہم نے پٹیشن دائر کی ہے جس میں ہم نے جوڈیشل مجسٹریٹ کی اس بات کو چیلنج کیا ہے کہ ضمانت دینا ان کے اختیار میں نہیں۔'

زیرِ حراست چند کارکن کون ہیں؟

محمد نوفل سلیمی

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز سے گریجویشن کرنے والے نوفل سلیمی اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں۔ ان کی بہن سندس سلیمی نے اپنے بھائی کی گرفتاری کے بعد اپنے ٹوئٹر اکاونٹ پر لکھا 'میرے بھائی نے گریجویشن کی تو اس کا نام 'ڈینز لسٹ' میں آیا۔ اس کے بعد اسے متحدہ عرب امارات کی کمپنی میں بہت اچھی نوکری ملی لیکن وہ اسے چھوڑ کر پاکستان واپس آیا اور اس نے سیکھنے کا سفر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شروع کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نوفل کو برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی سمیت دیگر اور یونیورسٹیوں میں داخلہ ملا۔' انھوں نے مزید لکھا 'میرے بھائی کے لیے آرام دہ زندگی کریئر اور انفرادی کامیابی کافی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ظلم وستم سہنے والے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا تھا اور ان کے لیے آواز اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے یہی خیالات اس کی سیاست بن گئے۔' ان کی بہن نے اپنے بھائی کے سماجی کاموں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا 'نوفل اسلام آباد کی کچی آبادیوں کو جبری بے دخل کرنے کے خلاف کھڑا ہوا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک سکول بنایا اور اسے چلایا۔ اس نے خواتین اور اقلیتوں کے حقوق اور بچوں کی بات کی۔' انھوں نے اپنی ایک ٹویٹ میں لکھا 'ہم نے کم عمری میں ہی اپنے والد کھو دیا تھا۔ تب سے ہی نوفل نے ایک اچھا بھائی اور بیٹا بن کر دکھایا ہے۔ میں اپنے بھائی کے لیے خوفزدہ ہوں لیکن مجھے اس کے ساتھ ساتھ فخر ہے نوفل میرا بھائی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ میرا بھائی اور اس کے تمام دوست جلد گھر واپس آ جائیں۔' نوفل کی گرفتاری پر ان کی والدہ راشدہ سلیمی نے اپنے ایک ویڈیو بیان میں کہا 'مجھے نوفل کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر اس انقلابی شخص کے لیے برا محسوس ہو رہا ہے جس کی اپنی سوچ ہے اور وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ریاست کے مفاہمتی بیانیے کے بجائے حق کی بات کرتے ہیں۔

> عوامی ورکرز پارٹی کی رکن طوبیٰ سید نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ احتجاجی مظاہرے سے **29** افراد کو گرفتار کیا گیا تھا جبکہ ان میں سے چھ کو بعد ازاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ گرفتار ہونے والے ساتھیوں نے **29** جنوری کی رات مختلف پولیس تھانوں میں گزاری اور اب انھیں جوڈیشل ریمانڈ پر **15** دن کے لیے اڈیالہ جیل بھیج دیا گیا ہے۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ گرفتار ہونے والے تمام افراد نے کوئی غلط اقدام نہیں اٹھایا۔ وہ صرف پرامن احتجاج کر رہے تھے جو ان کو آئین پاکستان دیتا ہے۔' اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے راشدہ سلیمی نے کہا 'ریاست صرف نوجوانوں پر اپنا کنٹرول چاہتی ہے کیونکہ وہ انقلاب کی بات کرتے ہیں، وہ تبدیلی کی بات کرتے ہیں، وہ اس بوسیدہ نظام اور معاشرے کو ٹھیک کرنے کی بات کرتے ہیں اور یہی ان کا جرم ہے۔' ان کا مزید کہنا تھا کہ ہماری جدوجہد جاری رہے گی اور

مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ان نوجوانوں کی آواز سنی جائے گی جو تبدیلی اور انقلاب کی بات کرتے ہیں۔

عمار رشید

عمار رشید کو بھی ایک روز قبل اسلام آباد میں منظور پشتین کی گرفتاری کے خلاف ہونے والے مظاہرے سے گرفتار کیا گیا ہے۔عمار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے عوامی ورکرز پارٹی کی رکن طوبیٰ سید کا کہنا تھا کہ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک اکیڈمک ہیں اور بیشتر حکومتی اور پرائیویٹ اداروں کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ عمار اسلام آباد کی قائداعظم یونیورسٹی اور پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس (پی آئی ڈی ای) میں بھی پڑھا چکے ہیں۔ان کی وابستگی عوامی ورکرز پارٹی سے رہی ہے اور فی الحال وہ عوامی ورکرز پارٹی پنجاب کے صوبائی یونٹ کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ عمار نے لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز سے اکنامکس میں بی ایس سی ڈگری حاصل کی۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے برطانیہ کی سسیکس یونیورسٹی سے ڈویلپمنٹ اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے۔عمار کو موسیقی کا بھی شوق ہے اور وہ باقاعدہ طور پر سیاسی تقریبات میں انقلابی گیت اور شاعری پیش کرتے ہیں۔طوبیٰ سید نے ان کے سماجی کاموں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ عمار نے سستی رہائش کے حق کے لیے آواز اٹھائی اور حکومت کی جانب سے غیر قانونی کچی بستیوں کی بے دخلی کے خلاف سیاسی اور قانونی مزاحمت کی۔ان کا کہنا تھا کہ عمار نے زیادہ تر کام تعلیم اور صحت کی اصلاحات، عوامی پالیسی، معیشت، ذیلی قومی حکمرانی، ملکی ترقی اور ٹیکس اصلاحات سے متعلق موضوعات پر تحقیق و تدریسی کام کیا ہے۔

محسن ابدالی

لاہور سے تعلق رکھنے والے محسن ابدالی ایم فل ایگریکلچر کے طالب علم ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔محسن کے ساتھ پڑھنے والے ساتھیوں نے بی بی سی کو بتایا کہ تعلیمی میدان میں محسن کا شمار ذہین طالب علموں میں کیا جاتا ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ محسن سماجی کارکن کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔محسن ماحولیاتی تبدیلی مارچ اور سٹوڈنٹ مارچ کے منتظم بھی رہ چکے ہیں جبکہ محسن نے ایگریکلچر اور ماحولیات پر کام کرنے کے لیے سوسائیٹیز بھی قائم پر رکھی ہیں۔عوامی ورکرز پارٹی کی طوبیٰ سید کے مطابق محسن کو ان کے گھر سے 'اغوا کیا گیا' تاہم بعد میں انھیں چھوڑ دیا گیا۔محسن کے بھائی عمر خان نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے الزام لگایا 'میرے بھائی کو اس لیے گرفتار کیا گیا کیونکہ انھوں نے لاہور کے لبرٹی چوک میں منظور پشتین کے گرفتاری کے خلاف ہونے والے احتجاج میں شرکت کی تھی جبکہ ان کا نام کسی ایف آئی آر میں نہیں۔'

ان کا کہنا تھا کہ 'پولیس نے رات ساڑھے تین بجے ہمارے گھر پر دستک دی اور والد کے پوچھنے پر سوال کیا کہ کیا محسن ابدالی آپ کا بیٹا ہے؟ میرے والد کی جانب سے جواب پر پولیس نے محسن ابدالی کو باہر بلانے کا کہا اور جیسے ہی میرا بھائی گھر کے دروازے پر آیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔'انھوں نے پولیس پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ پولیس نے محسن ابدالی کی گرفتاری کے بعد ہمارے گھر میں بنا سرچ وارنٹ کے زبردستی گھس کر تلاشی لی، گھر میں خواتین کی موجودگی کا بتانے کے باوجود پولیس اہلکاروں نے ہماری بات نہ سنی اور محسن کا موبائل اور لیپ ٹاپ بھی قبضے میں لے کر اپنے ساتھ لے گئے۔'محسن کے بھائی عمر خان کا کہنا ہے 'میرے والد کے پوچھنے پر کہ آپ میرے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہیں، پولیس اہلکاروں نے انھیں دھکے دیے اور ان کا بھی موبائل چھین لیا۔' عمر کا کہنا ہے کہ محسن کو حراست میں لے جانے والے کچھ افراد پولیس کی وردی میں تھے جبکہ باقی سادہ لباس میں تھے اور ایک شخص کے علاوہ تمام نے چہروں پر نقاب کیا ہوا تھا۔وہ کہتے ہیں کہ 'اگر میرا بھائی کسی کیس میں نامزد تھا بھی تو اس کا اصل نام محسن خان ہے جبکہ وہ محسن ابدالی کا لقب بطور سماجی کارکن استعمال کرتے ہیں اور ان کو لے جانے والوں نے آ کر محسن ابدالی کا پوچھا محسن خان کا نہیں۔'

(بشکریہ بی بی اردو)

ع// ڈھوک مری میں ولینٹائن ڈے

رات کے عین ساڑھے تین سے صبح کے ٹھیک ساڑھے چار تک
تقریبین انہی ٹرکوں نے تقریبین انہی ٹھڑوں پر تقریبین وہی مال اتارا
پانچ، نہیں تو چھے بجے، صفائی کرنے والے بھی چلے ہی آتے
اگر یہ علاقہ انکل کیپٹل کا سو ویری ڈسٹنٹ کزن نہ ہوتا
سات بجے سے دوکانیں اک دوجے کو ٹھوکے مار کے جگانے لگیں
آٹھ بجے تک دفتر، تعلیمی ادارے حسب معمول لاین حاضر تھے
گلیوں میں گٹڑوں کا ابال، سڑکوں پر گاڑیوں کا وبال، شہر کی دیگ کے کناروں تک اڈا
حد سے حد نو بجے تک، علاقے کا مطلع پھر گندے کا گندا، صاف کا صاف تھا
شام ہوئی تو پھر یہی سب کچھ ترتیب الٹ کر دہرایا گیا
ڈھوک مری میں ویلینٹاین ڈے جوش و خروش سے منایا گیا

(ڈھوک مری دارالحکومت کے پوش علاقے بنی گالہ کا مضافات ہے)

(ادریس بابر)

بارودی مواد کے دھماکہ سے 2 افراد زخمی

پنوں 15 جنوری 2020ء کو تھانہ جانی خیل کی حدود میں بارودی مواد کے دھماکہ سے دو افراد زخمی ہوگئے، ذرائع کے مطابق تھانہ جانی خیل کی حدود میں واقع بچکی جانی خیل میں دھماکہ آئی ای ڈی پھٹنے سے ہوا ہے، جس کے نتیجے میں دو افراد زخمی ہوگئے، زخمیوں کی شناخت رسول زمان اور احمد کے نام سے بتائی جاتی ہے، تاحال زخمیوں کو ہسپتال نہیں لایا گیا تھا۔

(نامہ نگار)

یہ ملک آخر کون چلا رہا ہے بھئی؟

عرفان حسین

اگر جمہوریت میں ہارنے والوں کی رائے یا ان کا خیال شامل ہونا لازمی ہوتا تو پھر پاکستان کسی بھی طور پر ایک جمہوری ملک نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔

یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں انتخابات کا انعقاد ہوتا ہے، ایک ایسی شاندار عمارت بھی موجود ہے جسے اسمبلی کہا جاتا ہے، اور جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا سارا سامان بھی ہے، لیکن شاید ہی کبھی ہارنے والوں نے یہ تسلیم کیا ہو کہ انتخابات منصفانہ اور شفاف ہوئے ہیں۔

بدقسمتی سے ان کی یہ رائے عموماً ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ ویسے تو میں یہاں دھاندلی کی مثالوں کے انبار لگا سکتا ہوں لیکن اپنا نکتہ رکھنے کے لیے گزشتہ انتخابات کی مثال ہی کافی ثابت ہوگی۔ کمپیوٹرائزڈ سسٹم سے شروع کرتے ہیں، گزشتہ انتخابات کے موقعے پر اہم حلقوں میں گھنٹوں تک سسٹم ڈاؤن رہا، جس کے باعث یہ خدشات ظاہر کیے جانے لگے کہ نتائج سے چھیڑ چھاڑ کی جا رہی ہے۔ میرے علم کے مطابق اس معاملے پر اب تک کسی قسم کی تحقیقات نہیں ہو سکی ہے۔ پولنگ سے ایک دن پہلے اپوزیشن امیدواروں کو مبیّنہ طور پر دھمکایا گیا۔ مختلف خفیہ فربہی حرکتوں نے 2018ء کے انتخابات کی اچھی خاصی ساکھ کو مجروح کر کے رکھ دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا منظر نامہ خطے کے دیگر ممالک میں دیکھنے کو کیوں نہیں ملتا؟ میں گزشتہ 20 برسوں سے سری لنکا میں ہونے والے انتخابات پر نظر رکھے ہوئے ہوں اور میں وہاں لڑی جانے والی انتخابی جنگوں کی تلخیوں کی گواہی دے سکتا ہوں لیکن وہاں نتائج کو ہمیشہ خوش دلی سے قبول کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس ملک میں تھوڑی سی دھاندلی ہوتی رہی ہے جو پورے نتائج میں تھوڑی بہت چھیڑ خانی ہی کر سکتی ہے۔

اگر بھارت کا ذکر کریں تو وہاں بھی عام انتخابات کے اس قدر بڑے حجم اور پیچیدگی کے باوجود انتخابی فراڈ کی محض چند شکایات ہی موصول ہوا کرتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ حکمران جماعت پر ریاستی وسائل کے غلط استعمال کے الزامات عائد ہوتے ہیں۔ لیکن الزامات اتنی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے کیونکہ امیدواروں کو وسیع فاصلے طے کرنے ہوتے ہیں۔

پھر ہمارے اور ان 2 ملکوں کے انتخابی منظر نامے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ پہلی بات تو ان ملکوں میں الیکشن کمیشن آزاد ہے اور اسے ایگزیکٹو اور عدلیہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں سیکیورٹی اسٹیبلشمنٹ انتخابات میں اپنا کردار ادا نہیں کرتی۔ اسی لیے ان کے پاس انتخابی عمل میں مداخلت اور کسی جماعت کی حامی یا حریف بننے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوتی۔

افسوس کے ساتھ پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ دہائیوں قبل سپریم کورٹ میں دائر کیے گئے اصغر خان کیس میں یہ کہا گیا تھا کہ مبیّنہ طور پر آئی ایس آئی ہی نے آرمی چیف کی ہدایت پر پیپلز پارٹی کو انتخابی فتح میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے امیدواروں میں نقدی رقم تقسیم کی تھی۔ لیکن معاملے یہ ہے کہ

> ان تمام باتوں سے میں یہی سبق اخذ کر سکتا ہوں کہ اسٹیبلشمنٹ کے چند عناصر کو انتخابات کے نتائج میں جتنی کم دلچسپی ہوگی اتنا ہی زیادہ انتخابات آزادانہ اور شفاف ثابت ہوں گے۔

آج تک اس تاریخی کیس کا فیصلہ نہیں سنایا گیا ہے۔

ان تمام باتوں سے میں یہی سبق اخذ کر سکتا ہوں کہ اسٹیبلشمنٹ کے چند عناصر کو انتخابات کے نتائج میں جتنی کم دلچسپی ہوگی اتنا ہی زیادہ انتخابات آزادانہ اور شفاف ثابت ہوں گے، جتنی زیادہ ان کی دلچسپی ہوگی اتنے زیادہ انتخابات مشکوک ہوں گے۔

پھر ایک بار جب خراب طریقوں کے ذریعے وزیرِ اعظم چن لیا جاتا ہے تو اسے اپنے سرپرستوں کے تابع رہنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے اختیارات آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا حال ویسا ہی ہوتا ہے جو نواز شریف کا ان کے کیریئر میں 2 مرتبہ ہوا ہے۔

اخلاقی جرآت رکھنے والے زیادہ تر افراد احکامات لینا نہیں چاہیں گے، خاص طور پر اس وقت تو بالکل بھی نہیں جب وہ عوامی مینڈیٹ کے ساتھ اقتدار میں آئے ہوں۔ لیکن اگر اس اکثریت کو باقاعدہ تیار کیا گیا ہو تو پھر ظاہر ہے حکمرانی کے حق پر سوال تو کھڑے ہوں گے۔

اسٹیبلشمنٹ کی طاقت کا مظاہرہ حال ہی پارلیمنٹ میں آرمی ایکٹ کی ریکارڈ اسپیڈ میں منظوری کے موقعے پر دیکھنے کو ملا۔ ملک کی 2 بڑی جماعتوں نے بڑے بول بولے، ساتھ ہی ساتھ مجوزہ قانون میں تبدیلیوں کی دھمکیاں بھی دیں لیکن آخر میں انہوں نے وہی کیا جس کا انہیں کہا گیا۔

ماضی میں جب جب ہمارے سیاستدانوں کو منتخب سویلین قیادت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان طاقت کے توازن کو ٹھیک کرنے کا موقع ملا ہے، تب تب انہوں نے خود کو جھکایا ہے۔ 2011ء میں جب امریکی کمانڈو ٹیم نے اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں واقع ان کے خفیہ ٹھکانے میں قتل کیا تو ایبٹ آباد کمیشن کی ناکامی پر وضاحت سننے کے لیے پارلیمنٹ کا ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا۔

اس وقت کے آئی ایس آئی چیف جنرل پاشا نے اس ناکامی کی مکمل ذمہ داری قبول کی اور استعفے کی پیش کش کی۔ لیکن اسمبلی میں موجود زیادہ تر قانون سازوں نے اسٹیبلشمنٹ کو اس کی ناکامیوں کے لیے ذمہ دار ٹھہرانے کا سنہری موقع گنواتے ہوئے ان کا استعفیٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

گزشتہ کئی برسوں سے دنیا میں ہماری ساکھ مسلسل گر رہی ہے۔ وہ پاکستان جو کبھی اپنے سے زیادہ طاقت والوں کو منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتا تھا وہ اب ایسے ملک میں تبدیل ہو چکا ہے جسے اپنی ڈوبتی معیشت بچانے کے لیے سعودی عرب، چین، امریکا اور آئی ایم ایف کی بخشیشوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یقیناً ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ پیسے دینے سے انکار کر دیں گے۔ مگر صرف ایک اسٹیبلشمنٹ ہی ملکی خزانے پر بوجھ نہیں بنی ہوئی، بلکہ اس میں قرضہ اقساط کی ادائیگی اور کرپشن نے بھی اپنا منفی ترین کردار ادا کیا ہے۔

اب اگر ہماری حقیقی قوتیں بدلتے حالات کے مطابق اپنے طریقہ کار میں لچک نہ لائیں اور وہ اسی طرح ہماری خارجہ پالیسی میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کرتی رہیں تو ہمارے سیاستدانوں کی جانب سے کسی نہ کسی حد تک مزاحمت دیکھنے کو ملے گی۔ ترک صدر اردوان بھی بغاوت کا شوق رکھنے والی فوج کو اس کے محدود اختیارات کا احساس صرف اسی وقت دلا سکے جب انہوں نے معیشت میں زبردست بہتری لانے اور پہلے سے کافی بہتر گورننس فراہم کرنے کی صلاحیت رکھنے والی حکومت قائم کر لی۔

لیکن یہ حالات پاکستان میں نہیں پائے جاتے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں وزیرِ اعظم کے اختیار میں بجٹ کا نسبتاً چھوٹا حصہ آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وزیرِ اعظم صاحب یا صاحبہ کو روزانہ کٹھ پتلی بن کر ان کے اشاروں پر چلنا ہوتا ہے جس نے ان کی ڈوری تھامی ہوتی ہے۔

(یہ مضمون 18 جنوری 2020ء کو ڈان اخبار میں شائع ہوا۔

خواتین کو اپنے حقوق کشکول میں مانگنے کی ضرورت نہیں

طاہرہ عبداللہ

معروف سماجی کارکن و خواتین کے حقوق کی علمبردار طاہرہ عبداللہ نے کہا ہے کہ 'خواتین آزاد پیدا ہوئیں، انہیں بطور والدہ، بہن، بیٹی یا بیوی اپنے حقوق مرد سے کشکول لے کر مانگنے کی ضرورت نہیں'۔

طاہرہ عبداللہ نے نجی ٹی وی سما کے پروگرام 'نیوز بیٹ' میں ڈراما نگار خلیل الرحمٰن قمر اور معروف صحافی اویس توحید کے ساتھ شرکت کی اور پروگرام کے دوران صنفی مساوات اور خاص طور پر ڈراموں میں خواتین کو کمزور دکھانے کے مسئلے پر بحث کی۔

پروگرام کے آغاز میں ڈراما نویس خلیل الرحمٰن قمر نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ہمیشہ ہی مضبوط خواتین کے کردار تشکیل دیے ہیں، وہ خواتین کی خودمختاری کے سب سے بڑے علمبردار ہیں تاہم انہوں نے صرف حالیہ ایک ہی ڈرامے 'میرے پاس تم ہو' میں خاتون کو کچھ منفی انداز میں دکھایا۔

ڈراما نویس نے کہا کہ کئی واقعات میں مرد، خواتین کو ذلیل کرتے ہیں اور ایسے واقعات میں ہم مرد حضرات کو برا بھلا بھی کہتے ہیں اور ایسے ہی واقعات بھی ہوتے ہیں جن میں خواتین بھی مرد حضرات کے ساتھ غلط کرتی ہیں تاہم ایسے واقعات پر ہم نہیں بولتے۔

خلیل الرحمٰن قمر نے دلیل دی کہ انہوں نے 'منجلی، انوکھی اور پیارے افضل' جیسے ڈرامے میں ان کے خاتون کردار کبھی کمزور نہیں ہوتے اور نہ ان کے ڈراموں میں خاتون کو روتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈراما نویس کا کہنا تھا کہ وہ مرتبے میں خواتین کو مرد سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں بلکہ مرد پر یہ حکم بھی ہے کہ وہ اپنی خاتون کو کما کر کھلائے گا ہاں البتہ جسمانی طور پر مرد کچھ زیادہ طاقتور ہے اور وہ اسی وجہ سے اپنی طاقت کا اظہار بھی کرتا ہے۔

ڈراما نگار کے مرد کے جسمانی طور پر طاقتور ہونے اور اس طاقت کے اظہار کے کمنٹس پر پروگرام اینکر نے طاہرہ عبداللہ سے سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ 'فیمز م' ایک انقلابی نظریہ ہے جس کے تحت عورت بھی ایک انسان ہے۔

طاہرہ عبداللہ کا کہنا تھا کہ عورت کی عزت کسی مرد کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کے اندر ہوتی ہے اور اسے اپنے حقوق کسی مرد سے مانگنے کی ضرورت نہیں اور وہ اپنے حقوق لے کر پیدا ہوتی ہے۔

سماجی رہنما و خواتین کے حقوق کی علمبردار کا کہنا تھا کہ خواتین کی عزت، وقار اور ان کی خودمختاری و آزادی کو آئین پاکستان میں بھی تحفظ دیا گیا ہے اور خواتین حقوق اپنے وجود میں ساتھ لے کر پیدا ہوئی ہیں انہیں کسی بھی مرد سے حقوق کشکول میں لینے کی ضرورت نہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور دوست ایک خاتون ہونے کے ناتے انسان ہے اور اسے انسان تسلیم کیا جائے۔

طاہرہ عبداللہ کا مزید کہنا تھا کہ عورت کے حیا اور وفا سے متعلق پیمانے بھی مرد حضرات نے ہی طے کر رکھے ہیں اور یہ پیمانے طے کرنے والا وہ شخص ہے جسے خود عورت نے جنم دیا اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہی مرد اس کے ساتھ ظلم کر کے اسے 'کوٹھے' پر بٹھا دیتا ہے اور وہاں بھی اس کے پاس 'مرد' ہی جاتے ہیں۔

عورت کی عزت کسی مرد کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کے اندر ہوتی ہے اور اسے اپنے حقوق کسی مرد سے مانگنے کی ضرورت نہیں اور وہ اپنے حقوق لے کر پیدا ہوتی ہے۔ سماجی رہنما و خواتین کے حقوق کی علمبردار کا کہنا تھا کہ خواتین کی عزت، وقار اور ان کی خودمختاری و آزادی کو آئین پاکستان میں بھی تحفظ دیا گیا ہے اور خواتین حقوق اپنے وجود میں ساتھ لے کر پیدا ہوئی ہیں انہیں کسی بھی مرد سے حقوق کشکول میں لینے کی ضرورت نہیں۔

طاہرہ عبداللہ کی جانب سے 'فیمز م' پر بات کرنے اور 'مرد' حضرات کے ذکر پر طویل بحث کرنے پر ڈراما نگار خلیل الرحمٰن قمر نے کہا کہ انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ 'مرد' کے ذکر پر سماجی رہنما کو غصہ آ جاتا ہے۔

خلیل الرحمٰن قمر نے جذباتی انداز میں سوال اٹھایا کہ اگر خواتین کو مرد حضرات سے حقوق نہیں چاہئیں تو پھر خواتین پلے کارڈز اٹھا کر حقوق کیوں مانگتی ہیں؟

انہوں نے مزید کہا کہ مظاہرے کرنے والی خواتین ہاتھی اور گھوڑوں سے نہیں بلکہ مرد حضرات سے ہی حقوق مانگتی ہیں اور وہ ایک بار پھر کہہ رہے کہ 'خواتین کو پتا ہی نہیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں'۔

خلیل الرحمٰن قمر نے جذباتی انداز میں کہا کہ خواتین، مرد حضرات سے ہی حقوق مانگ رہی ہوتی ہیں اور ان کے حصے سے ہی حقوق مانگ رہی ہوتی ہیں اور وہ انہیں ملیں گے۔

ڈراما نویس نے کہا کہ اس حساس موضوع پر ایک گھنٹے کا پروگرام ناکافی ہے اس لیے اس معاملے پر بحث کرنے کے کئی گھنٹوں کا پروگرام ہونا چاہیے اور وہ ٹی وی پر نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ٹی وی پر سب باتیں نہیں کہی جاسکتیں۔

پروگرام میں صحافی اویس توحید نے بھی خواتین کے حقوق اور صنفی مساوات پر بات کی اور کہا کہ آج بھی جدید دور میں پاکستان میں خواتین کے ساتھ ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اور ابھی تک خواتین کارو کاری میں قتل کی جا رہی ہیں۔

اویس توحید کی جانب سے اپنے ڈراموں اور حالیہ انٹرویوز میں دیے گئے بیانات پر تنقید کے بعد خلیل الرحمٰن قمر نے کہا کہ انہیں لگتا ہے کہ صحافی اور سماجی کارکن طاہرہ عبداللہ نے ان کے ڈرامے نہیں دیکھے اور نہ ہی انہوں نے انہیں پڑھ رکھا ہے۔

خیال رہے کہ حالیہ چند مہینوں میں خلیل الرحمٰن قمر کو 'میرے پاس تم ہو' ڈرامے میں خاتون کو منفی کردار میں دکھانے پر تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور خود بھی وہ انٹرویوز میں قدرے متنازع بیانات دے چکے ہیں۔

اکتوبر 2019 میں انہوں نے ایک انٹرویو میں متنازع بیان دیا تھا کہ 'وہ ہر عورت کو عورت نہیں کہتے، ان کی نظر میں عورت کے پاس ایک خوبصورتی ہے اور وہ اس کی وفا اور حیا ہے، اگر وہ نہیں تو ان کے لیے وہ عورت ہی نہیں'۔

انہوں نے مزید کہا تھا کہ 'اگر خواتین برابری کی بات کرتی ہیں تو وہ بھی مل کر مردوں کا گینگ ریپ کرلیں'، جس پر انہیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔

(بشکریہ ڈان اردو)

نیب قانون میں بنیادی تبدیلیاں ہی واحد چارہ ہے

آئی۔اے۔رحمان

سپریم کورٹ کی جانب سے نیب آرڈیننس 1999ء میں ترمیم کے لیے ملنے والی مہلت کسی غنیمت سے کم نہیں، کیونکہ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قانون کو معقول اور مؤثر ترین بنا سکتے ہیں۔

اس آرڈیننس کے نافذ ہونے کے بعد سے ہی اس میں نقائص نظر آنے لگے تھے۔ 2001ء اور 2002ء میں کی جانے والی بڑی بڑی ترامیم بھی اسے ایک غیر امتیازی قانون میں نہ بدل سکیں۔

دراصل جنرل مشرف کو بلاامتیاز احتساب سے متعلق تحفظات تھے جس کی تصدیق اس وقت ہی ہوگئی تھی جب نیب کے پہلے چیئرمین بننے والے ایک دیانتدار فوجی افسر نے مخصوص افراد کی تفتیش اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے بجائے عہدے سے مستعفی ہونے کو ترجیح دیں۔

اب چونکہ نیب کی اکثر کارروائیاں مخصوص ذرائع سے ملنے والی معلومات کی بنیاد پر کی جاتی ہیں، اس لیے نیب کارروائیوں میں پسند اور ناپسند کے عنصر کو خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ حکومت قانون کو مکمل طور پر تبدیل کرنے پر راضی ہوگی کیونکہ اگر اس سے کچھ بھی کم ہوا تو وہ اس قانون میں اصلاحات لانا تو دور کی بات، اس حوالے سے معمولی پیشرفت بھی شاید نہ ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی جانب سے گزشتہ ماہ اس قانون میں کی جانے والی ترامیم کو تنقید و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

مجوزہ ترامیم کی منظوری کے لیے کابینہ کو بھیجی جانے والی سمری میں صرف ان سرکاری عہدیداروں اور سرکاری ملازمین کا حوالہ دیا گیا تھا جن کے خلاف 'ضابطوں کی کوتاہی کے نام پر تفتیش کا آغاز کیا گیا تھا جس کا حقیقی کرپشن سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ذمہ داریوں نے نیب پر دباؤ بڑھا دیا ہے اور وفاقی حکومت کا کام بھی متاثر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں، نیب نے ان معاملات کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کرلیا ہے جس کا تعلق دیگر اداروں سے ہے اور احتساب بیورو محصول کاری، محصول عائد کرنے وغیرہ جیسے معاملات کی تفتیش کررہا ہے، لہٰذا نیب محصول کاری کے ریگولیٹری اداروں کے دائرہ اختیار میں مداخلت کررہی ہے'۔

یوں گزشتہ ماہ نیب آرڈیننس کی 2 شقوں (4 اور 9) میں کی جانے والی ترامیم صرف ان چند (دوست) سیاستدانوں اور سول سرونٹس کے خدشات کو دور کرنے کی ایک کوشش نظر آئی۔ تاہم کوئی بھی فریق ان سے خوش نہیں تھا۔

مثلاً، سول سرونٹس نے کم سے کم 13 تبدیلیوں کی تجویز دی تھی، جن میں سے چند معقول ہیں اور ان پر اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ان کی چند نہایت اہم تجاویز یہ تھیں:

- جسمانی ریمانڈ کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ 90 سے گھٹا کر 15 دن کیا جائے۔
- ملزم کی کرمنل پروسیجرل کوڈ کی دفعہ 497 کے تحت ضمانت کی درخواست منظور کی جائے۔
- نیب کے کام کے طریقوں اور ملزم کی گرفتاری یا ریفرنس کی منظوری جیسے اہم مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک نگران باڈی وجود میں لائی جائے۔
- آخری ریفرنس گرفتاری کے بعد 75 دنوں سے پہلے پہلے داخل کروایا جائے اور آخری ریفرنس داخل کیے جانے کے بعد ہی مقدمے کا آغاز کیا جائے۔
- نیب کی تمام تر بھرتیاں پبلک سروس کمیشن کے ذریعے کی جائیں۔
- واضح تحریری احکامات کے تحت گرفتاریاں عمل میں لائی جائیں۔
- اثاثوں کے انجماد کے لیے عدالتی حکم نامہ لازمی قرار دیا جائے تاکہ اثاثوں کا انجماد ناجائز فائدوں میں اضافے کا ذریعہ نہ بن سکے۔
- مجسٹریٹ کی نگرانی میں چھاپے مارے جانے چاہئیں۔
- مجسٹریٹ باقاعدگی کے ساتھ نیب ملزمان سے ملاقاتیں کریں۔

اس کے علاوہ نظرثانی عمل میں شامل کوئی بھی شخص سپریم کورٹ کی جانب سے آرڈیننس کے ان حصوں کو مسترد قرار دیے جانے کو نظر انداز نہیں کرسکتا جو پلی بارگین کے ذریعے لوٹی ہوئی دولت رضاکارانہ طور پر واپس کرنے یا آزادی خریدنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

احتساب آرڈیننس چیئرمین نیب کے عہدے کے ساتھ بڑی زیادتی کرتا ہے کیونکہ انہیں ایسی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جنہیں ایک شخص کے لیے سنبھالنا آسان نہیں ہے، اور اسے ایسے اختیارات سے نوازا ہے جنہیں کوئی بھی ایسا شخص تسلیم کرنا نہیں چاہے گا جو اپنی صحت اور ساکھ کی پرواہ کرتا ہو۔

چیئرمین نیب اسٹاف کا ہر لحاظ سے آقا ہے۔ وہ چاہے کسی کو بھی اپنی مرضی کی مدتوں کے لیے نیب میں مقرر کرسکتا ہے۔ ڈپٹی چیئرمین اور پراسیکیوٹر جنرل کی تعیناتی بذریعہ صدر ہوتی ہے، مگر اس میں بھی چیئرمین کی مشاورت شامل ہوتی ہے۔ (2002ء میں پراسیکیوٹر جنرل کی تعیناتی کے معاملے میں چیف جسٹس آف پاکستان کی مشاورت کی ضرورت کو ختم کردیا گیا تھا۔)

چیئرمین اگرچہ احتساب عدالتوں کے ججوں کو تو منتخب نہیں کرتا لیکن یہ عدالتیں ان کی جانب سے ریفرنس دائر کیے جانے کے بعد ہی کسی ملزم کے خلاف کارروائی کا آغاز کرسکتی ہیں۔

نیب چیئرمین اپنے غیر معمولی اختیارات کی بنیاد پر (حاضر سروس یا ریٹائرڈ) سرکاری عہدیداروں اور سول سرونٹس کے خلاف تفتیش کا حکم دے سکتا ہے۔ وہ ملزم کی جائیداد ضبط کرنے کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ ان کے اختیارات میں جو سب سے زیادہ متنازع پہلو ہے وہ یہ کہ لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد ایسے قید خانوں میں رکھنے کا حکم دیا جاسکتا ہے جو جیل حکام یا جیل کے پرزن رولز کے ماتحت نہیں ہوتے ہیں۔

شق 24 کے تحت کسی بھی ملزم کو 90 روز تک نیب کی تحویل میں رکھنے کی اجازت مانگنے کے لیے اسے عدالت کے سامنے پیش کرنا لازمی ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیکیورٹی سے متعلق قوانین میں 90 روزہ کا ہندسہ 9/11 کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے دوران شامل کیا گیا تھا، لیکن نیب قوانین میں اس ہندسے کی شمولیت ایسے بہت سے لوگوں کے لیے بے سبب تکالیف کا باعث بنی ہے جنہیں اعترافِ جرم یا وعدہ معاف گواہ بننے کی ہامی بھرنے تک تنگ جگہوں اور نہایت ناگوار حالات میں رہنا پڑتا ہے۔

یہ عمل اس قدر سخت ہے کہ جس کی آئین کی شق 14(2) میں ممانعت ہے۔ عدالتوں نے اس قسم کے مقدمات پر سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے اور پاکستان اسٹیٹ آئل کے سابق مینیجنگ ڈائریکٹر شیخ عمران الحق اور فواد حسن فواد کی 18 ماہ قید کے بعد ضمانت کی منظوری کے وقت ان کے مشاہدات کا حوالہ نیب سے منسوب کرتے ہوئے پیش نہیں کیا جاسکتا۔

نیب کی جانب سے اپنے ٹارچر نما طریقہ کار کو درست ٹھہرانے کے لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا ادارہ لگ بھگ 153 ارب روپے کی ریکوری کرچکا ہے اور اس کا رنامے پر ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل بھی ان کی معترف ہے، لیکن احتساب کے اس رکھوالے کو ریاست کے ٹیکس اور ریونیو وصول کرنے والے اداروں کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

احتساب آرڈیننس میں سب سے بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ نیب کو تفتیش کرنے، ریفرنس کی تیاری، ملزم کے خلاف قانونی چارہ جوئی اور متعدد کیسوں میں سزا دینے سے متعلق زبردست اختیارات بخشتا ہے۔

فردِ واحد کو بے پناہ اختیارات سونپنا انصاف اور بلاامتیاز عمل کے چھوٹے سے چھوٹے تقاضوں کے بھی برعکس ہے۔ سول سرونٹس کی یہ تجویز قابلِ غور اور ٹھیک ہے کہ مذکورہ کاموں کو نیب سے باہر کمیشن تشکیل دے کر اسی میں بااختیار اداروں کے درمیان تقسیم کیا جانا چاہیے۔

قومی احتسابی نظام کا جائزہ لینے پر کہیں بھی کرپشن سے بچاؤ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جبکہ کرپشن کے خلاف اقوامِ متحدہ کے کنونشن میں اس موضوع پر پورا ایک باب شامل ہے۔

اگر احتسابی آرڈیننس کرپشن کے بچاؤ کا ایک مناسب ذریعہ نہیں ہے تو نیب کو ایک کمیشن کی حیثیت میں دوبارہ تشکیل اور کرپشن سے بچاؤ کا ذمہ اسی کی ایک شاخ کو دینے پر غور کیا جاسکتا ہے۔

(یہ مضمون 30 جنوری 2020ء کو ڈان اخبار میں شائع ہوا۔ لکھاری ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے سابق ڈائریکٹر ہیں۔)

بارھویں عالمی اردو کانفرنس 2019

حارث خلیق

کلیدی خطاب

معزّز اراکینِ مجلسِ صدارت، مہمانانِ اعزاز،
خواتین وحضرات،

تسلیمات۔۔۔

عالمی اردو کانفرنس کے جملہ منتظمین کا میں تہہِ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے علم وادب کی ترقّی وفروغ کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے اور بارہ برس سے جس محنت اور لگن سے یہ کانفرنس منعقد کر رہے ہیں وہ لائقِ صَد تحسین ہے۔ آرٹس کاؤنسل آف پاکستان، کراچی کو بے حد مبارک باد۔ جب اس کانفرنس کے روحِ رواں اور میرے رفیقِ دیرینہ سید احمد شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ میں آج آپ سے مخاطب ہوں تو یقین کیجیے مجھے کچھ گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ اکابرینِ ادب اور آپ ایسے باعلم اور بالغ نظر حاضرین کے سامنے بات کرنا اپنی کم مائیگی کے احساس کو فزوں تر کرنے کے مترادف ہے۔ مگر شاہ صاحب صرف حُکم دینا جانتے ہیں اور انکار کی صورت میں، خصوصاً اپنے احباب سے، جس لہجے میں گفتگو کرتے ہیں اس کے بڑے بڑے لسانی اور ما متحمّل نہیں ہو پاتے۔ اس غریب کی کیا اوقات۔ چناں چہ اپنی چند گزارشات پیش کرنے یہاں حاضر ہوں۔ ان الفاظ پر کسی مقالے کا گمان نہ کر بیٹھیے گا، یہ محض چند اشاریے ہیں اور چند سوالات۔

خواتین وحضرات، میری دانست میں عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجتماع جس میں چوٹی کے لکھنے والے بھی موجود ہیں اور سنجیدہ پڑھنے والے بھی ہمیں ایک نہایت موزوں اور مناسب موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم اس وقت عالمِ انسانیت کو درپیش صورتِ حال پر ایک نظر ڈالیں اور پھر یہ دیکھیں کہ اردو لکھنے اور پڑھنے والے معاصر حالات سے کس حد تک آگاہ ہیں اور ان کے پیشِ نظر کیا معاملات ہونے چاہئیں۔

اس عہد میں عالمِ انسانیت کو دو عظیم بحرانوں کا سامنا ہے۔ ایک فطرت کا بحران اور دوسرا سماج کا بحران۔ فطرت کا بحران ماحولیات اور تیزی سے رونُما ہونے والی موسمی تبدیلیوں کا بحران ہے۔ اس کے نتیجے میں جہاں دوسری پرجاتیوں، نباتات اور حیوانات کے ناپید ہونے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے وہیں بنی نوع انسان کے معدوم ہو جانے کے اندیشے نے بھی ہمیں گھیر لیا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ تسخیرِ فطرت میں مشغول انسان پسپائی پر مجبور ہے۔ ہم نے بجائے فطرت کو خِرَد کے روبرو کرنے کے اپنی ہَوَس ناکی کے روبرو کر دیا اور اب فطرت ہم سے انتقام لینے کے درپَے ہے۔

دوسرا بحران انسانی سماج کا بحران ہے جو جمہوری اقدار کے زوال، انسانی حقوق کی پامالی، بڑھتے ہوئے تشدد اور دہشت گردی، اور فکری بددیانتی کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی مکالمے پر ریاستی بیانیے کا غلبہ ہے اور نتیجتاً آزادیِ اظہار پر قدغنیں ہیں؛ اجارہ دارانہ سرمایہ داری اور نیولبرل معاشی نظام کی حاکمیّت نے عوام النّاس کی بَدحالی میں اضافہ کر دیا ہے؛ مذہب یا قوم پرستی کی آڑ میں ہٹ دھرمی پر استوار مقبول سیاست کا تسلّط ہے جس نے ہر نوع کی اقلّیتی آبادیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے؛ غیر ریاستی عناصر، گروہ اور افراد عورت دشمنی اور نسل پرستی کے تباہ کن نظریات کی حفاظت اور نفاذ کے ازخود علم بَردار بن بیٹھے ہیں؛ ڈیجیٹل نگرانی کے ذریعے خفیہ ریاستی اداروں نے ہر فرد کے نجی معاملات سے متعلّق رازداری کو ختم کر دیا ہے؛ تجارتی ذرائع ابلاغ کی سنسنی خیزی اور اس پیشے سے وابستہ افراد کی سیاسی جانب داری نے ذہنوں میں خلفشار اور معاشرے میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔

یہ منظر نامہ دنیا کے ایک بڑے حصّے کا منظر نامہ ہے؛ امریکہ سے برازیل، روس سے ترکی، چین سے فلپینز، مصر سے ہندوستان۔ مگر ہمارے ہاں اس کے نتائج کہیں زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ ہمارے اہلِ علم میں موجودہ فطری اور سماجی بحرانوں کی شدّت کے پورے ادراک کا نہ ہونا ہے۔ اگر یہ ادراک کسی سطح پر موجود ہے بھی تو ہم میں ان بحرانوں سے نمٹنے کی سکت اور صلاحیّت نہایت محدود ہے۔ برصغیر کے مسلم سماج میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص اس صورتِ حال کی سنگینی کے دو اسباب ہیں: ہماری ریاست کی نوآبادیاتی ساخت اور

اس عہد میں عالمِ انسانیت کو دو عظیم بحرانوں کا سامنا ہے۔ ایک فطرت کا بحران اور دوسرا سماج کا بحران۔ فطرت کا بحران ماحولیات اور تیزی سے رونُما ہونے والی موسمی تبدیلیوں کا بحران ہے۔ اس کے نتیجے میں جہاں دوسری پرجاتیوں، نباتات اور حیوانات کے ناپید ہونے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے وہیں بنی نوع انسان کے معدوم ہو جانے کے اندیشے نے بھی ہمیں گھیر لیا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ تسخیرِ فطرت میں مشغول انسان پسپائی پر مجبور ہے۔ ہم نے بجائے فطرت کو خِرَد کے روبرو کرنے کے اپنی ہَوَس ناکی کے روبرو کر دیا اور اب فطرت ہم سے انتقام لینے کے درپَے ہے۔

ہمارے سماج کی علمی پَس ماندگی۔ ہماری ریاست کے تینوں مستقل اور مقتدر ادارے — نوکر شاہی، عدلیہ اور عسکریہ— ہمیں برطانوی راج سے ورثے میں ملے ہیں اور ریاست چوں کہ اب تک شہریوں کو رعایا تصوّر کرتی ہے اس لیے یہ ادارے شہریوں کے بنائے ہوئے اداروں یعنی سیاسی جماعتوں، شہری انجمنوں اور آزاد ذرائع ابلاغ سے متحارب رہتے ہیں۔ ہماری مقنّنہ اور نسبتاً جدید دستور اس تنازعے کو حل نہیں کرا پائے کیوں کہ وہ خود ان مستقل اداروں کے تابع رہے ہیں۔

ہماری علمی پَس ماندگی نے طویل عرصے سے اجتماعی فکر کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ زیادہ دور نہیں جاتے۔ پچھلے پچاس برس کے دوران فلسفے اور مذہب، طبیعی وحیاتیاتی علوم، سماجیات اور بشریات، کسی شعبے میں اپنا کوئی ایک ایسا معنی خیز کام یاد کریں جس نے ہمارے سماج کے نظم ونسق یا فکر ودانش کو نظری طور پر متاثّر کیا ہو۔ یقیناً مستثنیات ہمیشہ سے موجود ہیں مگر کروڑوں کی آبادی میں ان افراد و خواتین کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ہم نے طبیعات دانوں کی جگہ انجنیئر ، ماہرینِ حیاتیات کی جگہ ڈاکٹر، سماجی سائنسدانوں کی جگہ تبصرہ نگار اور علمائے دین کی جگہ مبلّغین پیدا کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ علمی نظریہ سازوں اور آزاد تاریخ دانوں کے فقدان کے باعث ہم جس فکری انحطاط کا شکار ہیں اس نے ہماری نفسیات میں چار اہم عناصر کو استحکام بخشا ہے: تعصّب، تنہائی، خوف اور غصّہ۔

خواتین و حضرات، اس صورتِ حال میں اگر ہمارے پاس کچھ ہے تو فن اور ادب۔ یہاں نہ تخلیقی صلاحیّت کا کال ہے اور نہ ادبی دانش کا۔ مگر فطری یا ماحولیاتی بحران جو وجودی بحران ہے اور انسانی سماج کا بحران جو بنی آدم اور بنتِ حوّا کی عظیم اکثریت کی بے توقیری پر آمادہ ہے، کیا ہمارا ادب ان بحرانوں سے نمٹنے کی ذمّہ داری اٹھا سکتا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہوگا۔ ہمارے ہاں احیائے علوم اور توانا سیاسی وسماجی تحریکوں کی بغیر ان بحرانوں سے نہیں نمٹا جا سکتا۔ مگر ادب کا یہ کردار ضرور ہے کہ وہ جھنجوڑے، جگائے، چوکنا کرے، شعور وادراک میں اضافہ کرے اور سب سے بڑھ کر پڑھنے والے کی حسیّت پر سان چڑھائے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی بھی ادب پارے کی حیثیت کا تعیّن، چاہے وہ نظم ہو یا نثر، اثر آفرینی اور جمالیات کی کسوٹی پر ہوگا۔ مگر میں نے پہلے بھی کہیں یہ بات عرض کی تھی کہ ادب تخلیق کرنے کی تحریک جہاں درونِ ذات سے جنم لیتی ہے وہیں بیرونی کشاکش بھی اس کی بڑی محرّک ہے۔ میرے نزدیک یہ کیفیات متّصل ہیں نہ کہ متضاد۔ ویسے بھی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے معاملات تو تب زیرِ بحث آ سکتے ہیں جب زندگی باقی رہے گی اور اظہارِ رائے پر پابندیوں کا وجود نہ ہوگا۔ پابلو نرودا، مایا اینجلو، ناظم حکمت، محمود درویش، فروغ فرّخ زاد، غنی خان، شیخ ایاز اور فیض احمد فیض محض اپنے فنّی محاسن کی بنا پر اس مقام پر فائز نہیں۔ بلکہ ان کے جمالیاتی شعور کی وسعت نے داخلی محسوسات کے ساتھ ساتھ خارجی کیفیات کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ میرا رشتہ چوں کہ نثر کے مقابلے میں شعر سے زیادہ گہرا ہے اس لیے جبلّی طور پر میں نے آپ کو شعرا کی مثال دی۔ یہی بات نثر نگاروں پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لیے ہمارے آج کے ادیبوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ حسِّ لطیف کی آبیاری تبھی ممکن ہے جب سیاسی کثافت اور ماحولیاتی آلودگی کا رَدّ لکھا جائے۔ جمالیاتی تقاضے پورے ہو جائیں گے اگر یہ مسائل شعور کے اندر اُتر جائیں نہ کہ ایک اُتھلے اور یک رخی سیاسی و سماجی ایجنڈے کی صورت میں نمودار ہوں۔

خواتین وحضرات، یہ عالمی اردو کانفرنس ہے اور میرا آخری نکتہ اردو ادیبوں اور شاعروں کو نہایت عاجزی کے ساتھ چند سوالات کی جانب توجّہ مبذول کرانے سے متعلّق ہے۔ ہمارے اکابرین اپنا کردار ادا کر چکے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ میں اپنے ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں سے مخاطب ہوں۔

اردو، دنیا بھر کی اُن دو یا تین زبانوں میں شامل ہے جنہیں مادری زبان یا ماں بولی کہنے والے اِن زبانوں کو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی کُل تعداد کا اقلیتی حصّہ ہیں۔ چناں چہ اس زبان میں لکھنے والوں سے کہیں زیادہ توقّعات وابستہ ہیں۔ آج کے پاکستان میں کیا اردو کے ادیبوں کو بلوچستان کی مزاحمتی تحریک، وزیرستان میں عزّت نفس کی بحالی کے سوال، ٹھٹّہ اور بدین سے پانی کی کمیابی کے باعث نقل مکانی، مذہبی اقلیّتوں کے ساتھ ناروا سلوک، عورت آزادی مارچ اور ملک کے طلبہ میں پیدا ہونے والے تازہ ابھار کا ادراک ہے؟

کیا ہمیں کراچی کی بلدیہ فیکٹری میں لگی آگ یاد ہے جس میں سینکڑوں محنت کش مرد وزن جُھلسا کے مار دیے گئے تھے؟ کیا ہمیں تحریر وتقریر پر لگائی جانے والی پابندیوں اور ان سے مرتّب ہونے والے نتائج کا شعور ہے؟ چوں کہ تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے کہ اگر آج کالم نہیں چھپ سکتا تو کل افسانہ بھی نہیں چھپ سکے گا۔ اگر آج "کلنگ فیلڈز آف کراچی" کی نمائش نہیں ہو سکے گی تو کل مشاعرہ بھی نہیں ہو پائے گا۔ میں اپنے ساتھیوں سے نعرہ زنی کا مطالبہ نہیں کرتا نہ یہ ادیبوں کا کام ہے مگر اپنے جمالیاتی شعور میں داخلی محسوسات اور خارجی کیفیات دونوں کو گوندھ لینے کی درخواست ضرور کرتا ہوں۔

ممتاز مصنّفہ جارج ایلیٹ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شے زندگی کے نزدیک ترین ہے تو وہ فن ہے۔

("Art is the nearest thing to life)

اگر ہم یہ ممکن بنا سکیں تو بقول مصطفٰی زیدی،

شاید تمہیں نصیب ہو اے کُشتگانِ شب
روئے اُفق پہ صُبح کے آثار دیکھنا!

یہ خطاب آرٹس کونسل آف کراچی کے زیر اہتمام 12ویں عالمی اردو کانفرنس کے شرکا سے کیا گیا۔

(حارث خلیق انگریزی اور اردو کے شاعر اور مضمون نگار ہیں۔ آج کل ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) کے سیکریٹری جنرل ہیں۔)

ہماری علمی پَس ماندگی نے طویل عرصے سے اجتماعی فکر کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ زیادہ دور نہیں جاتے۔ پچھلے پچاس برس کے دوران فلسفے اور مذہب، طبیعی وحیاتیاتی علوم، سماجیات اور بشریات، کسی شعبے میں اپنا کوئی ایک ایسا معنی خیز کام یاد کریں جس نے ہمارے سماج کے نظم ونسق یا فکر ودانش کو نظری طور پر متاثّر کیا ہو۔ یقیناً مستثنیات ہمیشہ سے موجود ہیں مگر کروڑوں کی آبادی میں ان افراد وخواتین کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ہم نے طبیعات دانوں کی جگہ انجنیئر ، ماہرینِ حیاتیات کی جگہ ڈاکٹر، سماجی سائنسدانوں کی جگہ تبصرہ نگار اور علمائے دین کی جگہ مبلّغین پیدا کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ علمی نظریہ سازوں اور آزاد تاریخ دانوں کے فقدان کے باعث ہم جس فکری انحطاط کا شکار ہیں اس نے ہماری نفسیات میں چار اہم عناصر کو استحکام بخشا ہے: تعصّب، تنہائی، خوف اور غصّہ۔

سزائے موت کے منتظر بچے

پاکستان میں جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند افراد کی ایک بڑی تعداد اُن بچوں کی ہے جن پر ملکی و عالمی قانون کے تحت سزائے موت تو کُجا کسی بھی سزا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ انہیں جیلوں میں رکھنا ہی تمام قوانین چاہے وہ ملک کی سطح پر ہیں یا عالمی سطح پر، اور تمام اخلاقی اقدار کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے میں کئی ایسے ہونہار کمسن بچے پڑے ہیں جو وہاں پڑے پڑے اپنی زندگی کے دن گن رہے ہیں اور اس لمحے کے منتظر ہیں جب حکام انہیں پھانسی گھاٹ پہ لے جائیں گے جبکہ کئی کو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا ہے۔ ذیل میں جسٹس پراجیکٹ پاکستان (جے پی پی) کی ایک تحقیق میں سامنے والے چند حقائق کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

آفتاب بہادر کو ایک خاتون اور اس کے دو بچوں کے قتل کے جرم میں 15 برس کی عمر میں گرفتار کیا گیا تھا۔ آفتاب آخر تک اپنی بے گناہی کا دعویٰ کرتا رہا۔ آفتاب کے خلاف گواہی دینے والا واحد چشم دید گواہ اپنے بیان سے منحرف ہو گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ پولیس نے جھوٹی گواہی دینے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا تھا۔ درحقیقت، اس نے اعتراف کیا کہ آفتاب جائے وقوعہ پر موجود ہی نہیں تھا۔ تاہم، سپریم کورٹ آف پاکستان نے بریتی ثبوت پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ عدالت کا کہنا تھا کہ تازہ اپیل بے محل تھی۔ چنانچہ، سزائے موت کے انتظار میں 22 سال گزارنے کے بعد، آفتاب بہادر کو 38 سال کی عمر میں پھانسی دے دی گئی۔

اسے **10** جون **2015**ء کو پھانسی دی گئی۔

دنیا کے 160 ممالک کی طرح، پاکستان نے بھی ایسے قوانین وضع کر رکھے ہیں جو نوعمر مجرموں، یعنی ایسے افراد جنہوں نے 18 سال کی عمر سے قبل جرم کا ارتکاب کیا ہو، کے خلاف سزائے موت کے استعمال کی ممانعت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، حکومت پاکستان اقوام متحدہ کے بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق (آئی سی سی پی آر) اور بچوں کے حقوق کے معاہدے (سی آر سی) دونوں کی فریق ہے، جو نو عمر مجرموں کے لیے سزائے موت کی قطعی طور پر ممانعت کرتے ہیں۔ تاہم، اس واضح پابندی کے باوجود، آفتاب بہادر جیسے نوعمر مجرم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

ایک ایسے فوجداری نظام انصاف کے نتیجے میں، جو عدالتی نظام، گرفتاری، تفتیش، ٹرائل، سزایابی، اور سزا کے ہر مرحلے پر انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کی خلاف ورزی کا باعث بنتا ہے، سزائے موت کا پاکستان کی غیر محفوظ ترین آبادی جیسے کہ ذہنی طور پر بیمار افراد، جسمانی طور پر معذور افراد، اور نوعمر مجرموں پر غیر متناسب اطلاق کیا جاتا ہے۔

سزائے موت پر پابندی کے خاتمے سے اب تک کم از کم چھ نوعمر بچوں کو پھانسی دی جا چکی ہے، باوجود اس کے کہ ایسے ٹھوس شواہد موجود تھے جو ان کی نوعمری کی تائید کرتے تھے۔

پھانسیوں پر دوبارہ عملدرآمد شروع ہونے کے بعد، نوعمر مجرموں کو سزائے موت سے تحفظ فراہم کرنے میں پاکستان کی ناکامی کو بین الاقوامی ماہرین کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا رہا۔ جون 2015ء میں، اقوام متحدہ کے چار ماہرین نے حکومت پاکستان پر زور دیا کہ وہ نوعمر مجرموں کی پھانسی پر عملدرآمد روک دے۔ انہوں نے پاکستان میں 'سزائے موت کے منتظر سینکڑوں نوعمر مجرموں کی موجودگی کی مذمت کی اور اسے پاکستان کی قانون سے متعلق بین الاقوامی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی قرار دیا۔ اسی طرح، جون 2016ء میں اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ تمام نوعمر مجرموں کی پھانسیاں روک دے اور ان تمام مقدمات کو دوبارہ کھولے جہاں اس بات کا ہلکا سا بھی اشارہ موجود ہو کہ مبینہ جرم کے ارتکاب کے وقت ملزم کم عمر تھا۔

پاکستان نے 2000ء میں نوعمر بچوں کا نظام انصاف آرڈیننس (جے جے ایس او) وضع کیا تاکہ یہ اپنے نظام انصاف کو اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق سے متعلق معاہدوں کے تحت خود پر عائد ذمہ داریوں کی مطابقت میں لا سکے۔ 2018ء میں، جے جے ایس او کو منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ بچوں کا نظام انصاف ایکٹ (جے جے ایس اے) وضع کیا گیا۔ یہ قانون نوعمر بچوں کی پھانسیوں کی ممانعت کرتا ہے اور ججوں و وکلاء کی جانب سپیشلائزڈ عدالتوں، سماعتوں اور حراستی مراکز کے لیے دفعات تشکیل دیتا ہے۔ تاہم جیسا کے نفاذ کے 18 سال بعد بھی اسے بظاہر عملی طور پر نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس قانون کا نفاذ مؤثر بہ ماضی نہیں تھا جس کی وجہ سے 2000ء میں اس قانون کے نفاذ سے پہلے سزائے موت پانے والے نوعمر مجرم اس کے تحفظ سے محروم رہے۔ ایک صدارتی حکم نامے کے ذریعے، ان تمام نوعمر مجرموں کی نوعمری کی تحقیقات کی بنیاد پر، ان کے لیے 'خصوصی رعایت' کا اعلان کیا گیا جن کی سزائے موت کی تصدیق جے جے ایس او کے نفاذ سے پہلے کی گئی تھی۔ تاہم، ایسی تحقیقات کا شاذونادر ہی انعقاد کی گیا اور جب ایسا کیا بھی گیا تو ایسی تحقیقات نااہلی، ناقابلیت اور انسانی حقوق کے معیارات کی خلاف ورزیوں سے بھری پڑی تھیں۔

پاکستان نوعمر بچوں کی عدالتیں اور کم سن بچوں کی اصلاح کے ادارے قائم کرنے، اور کم سن بچوں کے لیے مؤثر قانونی امداد کے لیے انتظامات کرنے میں بھی ناکام رہا جیسا کہ جے جے ایس او اور جے جے ایس اے میں کہا گیا ہے۔ پیدائش کے اندراج کی کم شرح اور بچوں کے جرم کے حوالے سے قانون نافذ کرنے والے اداروں اور عدلیہ کی حساسیت کے فقدان کے تناظر میں، کم سن مجرموں کی ایک بڑی تعداد ان ادارتی تحفظات کے دائرے سے باہر رہ جاتی ہے جن کا درحقیقت عملی طور پر نفاذ کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً، کم سن بچوں کے نظام انصاف کا ان افراد پر شاذونادر اطلاق ہوتا ہے جن کے تحفظ کے لیے یہ ترتیب دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں موت کی سزاؤں کی ایک بڑی تعداد کا اطلاق کم سن مجرموں پر ہو رہا ہوتا ہے۔ جب ایک بار ان کم سن بچوں کو سزا ہو جائے تو یہ اپیلوں اور سزا کے بعد ملنے والے ریلیف سے مؤثر طور پر رجوع کرنے سے محروم رہتے ہیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب ان کی بے گناہی کے شواہد موجود ہوں۔ یہ تمام مسائل بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزیوں کو جنم دیتے ہیں اور اس سے ایک ایسے تباہ حال فوجداری نظام انصاف کی نشاندہی ہوتی ہے جو کم سن مجرموں کو سزا کی شدید ترین اور ناقابل تنسیخ شکل یعنی سزائے موت سے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

خلاف ورزیوں کی ناقابل تنسیخ نوعیت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ پاکستان سزائے موت پر پابندی دوبارہ بحال کرے اور سزائے موت کے منتظر قیدیوں کے مقدمات کی آزادانہ تحقیقات کرے، خاص طور پر ان مقدمات کی جن میں مجرموں کی کم عمری کے الزامات عائد کیے گئے ہوں۔ اس کے علاوہ، مستقبل میں کم سن مجرموں کی پھانسیوں کی روک تھام اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ انہیں انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کے تحت مطلوبہ تحفظ حاصل ہو، کم سن بچوں کے نظام انصاف میں جامع اصلاحات کی جائیں جن کا دائرہ گرفتاری کے وقت عمر کے تعین سے لے کر پھانسی سے پہلے رحم کی اپیل منظور کیے جانے تک وسیع ہو۔

I۔ بین الاقوامی قانون کے تحت کم سن مجرموں کی پھانسی کی ممانعت

بین الاقوامی قانون میں متعدد کثیر فریقی معاہدوں کی جانب سے 18 سال سے کم عمر مجرموں کی پھانسی کی واضح طور پر ممانعت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کا تعین مبینہ جرم کے ارتکاب کے وقت مجرم کی عمر سے کیا جاتا ہے اور یہ ممانعت کم

سن فرد کے 18 سال کی عمر کو پہنچنے پر ختم نہیں ہوجاتی۔ اقوام متحدہ کا بچوں کے حقوق سے متعلق معاہدہ، جس کی پاکستان نے 1990ء میں توثیق کی تھی آرٹیکل 37 (الف) کے تحت تجویز کرتا ہے کہ 18 سال سے کم عمر افراد کی جانب سے سرزد ہونے والے جرائم کے لیے رہائی کے امکان کے بغیر نہ تو موت کی سزا دی جائے گی اور نہ ہی عمر قید کی۔ علاوہ ازیں، بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق (آئی سی سی پی آر) کے آرٹیکل 6(4) میں کہا گیا ہے کہ 18 سال سے کم عمر افراد کی جانب سے سرزد ہونے والے جرائم پر سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ حکومت کے اندر موجود باڈیز بھی سزائے موت میں سے کم سن مجرموں کے اخراج کا اس بنیاد پر مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ کم سن مجرموں کے خلاف سزائے موت کا استعمال بین الاقوامی قانون کے برعکس ہے۔ متعدد متعلقہ قراردادیں بغیر کسی ووٹ کے منظور کی گئی ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ ریاستوں کے مابین اس بات پر متفق ہیں کہ ان دفعات کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ مثال کے طور پر، 1984ء میں اقوام متحدہ کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے سزائے موت کا سامنا کرنے والوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دینے والے حفاظتی اصول کی منظوری دی۔ اس دستاویز کا اصول نمبر 3 کہتا ہے: 'جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم عمر کے افراد کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی'۔ معاشی و سماجی کونسل کے حفاظتی اقدامات، جس کی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی 14 دسمبر 1984ء کی قرار داد نمبر 118 / 39 میں تائید کی تھی، بغیر کسی ووٹ کے منظور ہوگئی۔ بین الاقوامی برادری کو اس بات کا احساس ہے کہ فوجداری نظام انصاف کے مقاصد کی خاطر، بچے بڑوں سے جبلی طور پر مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا وہ قانونی عمل، بالخصوص سزا سنائے جانے کے دوران خصوصی برتاؤ کے حقدار ہیں۔ آئی سی سی پی آر اسی مناسبت سے کہتا ہے کہ یہ طریقہ کار ایسا ہوگا کہ یہ ان کی عمر اور بحالی نو کے فروغ کی خواہش کو مدنظر رکھے گا اور یہ کہ کم سن ملزموں کو بالغوں سے الگ رکھا جائے گا اور انہیں جتنا جلد ممکن ہو سکے عدالتی فیصلے کے لیے لایا جائے گا۔ اسی طرح، سی آر سی ان حفاظتی اقدامات کا یہ کہتے ہوئے اعادہ کرتا ہے کہ آزادی سے محروم ہر بچے کو بالغ سے الگ رکھا جائے گا ماسوائے ایسا نہ کرنا بچے کا بہترین مفاد تصور کیا جائے۔

انتہائی سزا یعنی سزائے موت بچے کی محدود سزاواری کو سمجھنے میں ناکام رہتی ہے اور بحالی نو اور تلافی کے مواقع کی نفی کرتی ہے۔ اسی لیے، بین الاقوامی قانون کم سن مجرموں کو موت کی سزا اور پھانسی دینے کی واضح طور پر ممانعت کرتا ہے۔

پاکستان کو اقوام متحدہ کی جانب سے تنقید کا سامنا

سزائے موت پر پابندی ہٹانے کے بعد سے حکومت پاکستان کو اپنی انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی ذمہ داریوں کے احترام میں ناکامی کی بناء پر بین الاقوامی سفارتی برادری کی جانب سے مسلسل تنقید کا سامنا رہا ہے۔ 20 مارچ 2015ء کو، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چار ماہرین نے حکومت پاکستان پر زور دیا کہ وہ کم سن مجرم شفقت حسین کی پھانسی روک دے۔ ان ماہرین کا موقف تھا کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں سزائے موت کے منتظر 'سینکڑوں' قیدی کو ان جرائم کی بناء پر سزا دی گئی ہو جو ان سے کم عمری میں سرزد ہوئے ہوں۔ ماہرین نے اس بات پر زور دیا کہ 'بتایا گیا ہے کہ شفقت کو 2004ء میں اس کی گرفتاری کے بعد پولیس نے نو دن تک تشدد کا نشانہ بنا کر اس سے اقبال جرم کروایا۔ اقوام متحدہ کے ماہرین نے جون 2015ء میں شفقت کی دی گئی پھانسی کی ایک بار پھر مذمت کی۔ ماہرین نے اس بات پر زور دیا کہ 'پاکستانی قانون اور بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق کے آرٹیکل 6 اور بچوں کے حقوق سے متعلق بین الاقوامی معاہدے کے آرٹیکل 37 (الف) کے تحت سزائے موت کا کسی ایسے مدعا علیہ پر اطلاق نہیں کیا جاسکتا جس کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم ہو۔

تاہم، شفقت کو اگست **2015**ء میں پھانسی دے دی گئی۔

علاوہ ازیں، مئی 2015ء میں اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی نے اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق سے متعلق معاہدے کے تحت پاکستان پر عائد ذمہ داریوں کی انجام دہی کا جائزہ لیا۔ کمیٹی نے اپنی حتمی مشاہدات میں کہا کہ 'اسے ان متعدد افراد کی پھانسیوں کی اطلاعات پر سخت تشویش ہے جنہوں نے جرائم کا ارتکاب اس وقت کیا جب ان کی عمر 18 سال سے کم تھی، یا جہاں دسمبر 2014ء میں پھانسیوں پر پابندی اٹھائے جانے کے بعد فرد کی عمر متنازعہ تھی، باوجود اس کے کہ بین الاقوامی برادری اور اقوام متحدہ کی جانب سے اس حوالے سے کئی مطالبات کیے گئے تھے۔ کمیٹی نے سزائے موت کے منتظر افراد کی ایک بڑی تعداد اور اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ 'ان افراد کو اپنی عمر کی بنیاد پر سزا کو چیلنج کرنے سے متعلق طریق ہائے کار تک محدود رسائی حاصل ہے۔ چنانچہ، کمیٹی نے حکومت سے سفارش کی کہ وہ بچوں کی پھانسیوں پر عملدرآمد روک دے اور ان تمام مقدمات کا از سرِ نو جائزہ لے جہاں اس بات کا اشارہ موجود ہو کہ ملزم کم سن تھا تاکہ یا تو اسے رہا کیا جائے یا اس کی سزا میں تبدیلی کی جائے۔

تاہم، بین الاقوامی برادری کی جانب سے مسلسل مذمت کے باوجود، حکومت پاکستان نے کم سن بچوں کو سزائے موت اور پھانسی دینے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے جو بین الاقوامی قانونی معیارات کی خلاف ورزی ہے۔

II۔ پاکستان میں بچوں کا نظام انصاف: ایک ناقص قانونی نظام

الف۔ بچوں کا نظام انصاف ایکٹ **2018**ء

بچوں کا نظام انصاف ایکٹ 2018 (جے جے ایس اے) وہ تازہ ترین اور بنیادی قانون ہے جس کے تحت پاکستان میں کم سن افراد کے انصاف کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ قانون 'فوجداری نظام انصاف اور کم سن بچوں کے انضمام نو' کے انتظام کی خاطر وضع کیا گیا تھا۔ جے جے ایس اے کے وضع کیے جانے کے بعد، بچوں کے نظام انصاف کا آرڈیننس، 2000ء (جے جے ایس او) جو 2000ء سے 2008ء تک پاکستان میں بچوں کے نظام انصاف کا انتظام کرنے والا بنیادی قانون تھا، منسوخ ہوگیا۔

اس قانون کا مقصد پاکستان کے بچوں کے نظام انصاف سے متعلق قوانین کو بین الاقوامی معیارات کے مطابق بنانا اور جے جے ایس او میں پائی جانے والی کچھ خامیوں کو دور کرنا تھا۔ جے جے ایس او میں پائی جانے والی خامیوں میں عمر کے تعین کا ناقص طریقہ کار، جس کے نتیجے میں بہت سے کم عمر افراد کی گرفتاری اور ان کے خلاف قانونی کارروائی بالغوں کے طور پر کی جاتی ہے، اور دہشت گردی کے مقدمات میں بچوں کی عدالتوں کے دائرہ اختیار کے بارے میں پایا جانے والا ابہام شامل ہیں، کیونکہ انسداد دہشت گردی ایکٹ کی تشریح اس طرح سے کی گئی ہے کہ اسے دیگر قوانین پر بالادستی حاصل ہے۔

قانون میں فراہم کیے گئے اہم حفاظتی اقدامات میں شامل ہیں:

- کسی ایسے فرد کو سزائے موت دینے کی ممانعت جو جرم کے ارتکاب کے وقت کم عمر ہو (سیکشن 16(1))
- کسی کم سن مجرم کو مشقت کی سزا دینے یا زنجیروں میں قید رکھنے کی ممانعت (سیکشن 16(2))
- حراست میں لیے جانے کے بعد 24 گھنٹوں کے اندر ریاست کے خرچ پر کسی ایسے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے حق جو کم از کم 7 سال کا تجربہ رکھتا ہو (سیکشن 3)
- بچوں کی خصوصی عدالتوں کا قیام جنہیں کم سن افراد کے مقدمات کی سماعت کا خصوصی اختیار حاصل ہو۔
- گرفتار کرنے والے افسر کی ذمہ داری ہے کہ وہ گرفتاری کے بعد جتنا جلد ممکن ہو سکے، گرفتار کیے گئے بچے کے سرپرست کو بچے کی گرفتاری اور بچوں کی عدالت، جس میں بچے کو پیش کیا جائے گا، سے متعلق

تفصیلات سے آگاہ کرے (سیکشن 5)

- بچے کے کسی بالغ فرد کے ساتھ مشترکہ ٹرائل کی ممانعت (سیکشن 12)
- کسی بھی عام ذرائع جیسے کہ اخبارات، میگزین، جریدے میں بچے کی شناخت ظاہر کرنے سے تحفظ (سیکشن 13)
- نوعمر خواتین کو مرد پولیس افسران کی جانب سے گرفتاری یا تفتیش سے حاصل خصوصی تحفظ (سیکشن 17)
- جیسا دیگر قوانین بشمول انسداد دہشت گردی ایکٹ سے مقدم ہے (سیکشن 22)
- ایسے مجرم جو کم سن ہونے کا دعویٰ کرتے ہوں، انہیں یہ حق حاصل ہے کہ پولیس اسٹیشن کا انچارج ضروری دستاویزات (جیسے کہ پیدائش کا سرٹیفکیٹ، تعلیمی اسناد وغیرہ) یا ان دستاویزات کی عدم موجودگی میں طبی معائنے کے ذریعے ان کی عمر کی جانچ کرے (سیکشن 8)

جے جے ایس اے ایک نیا قانون ہے اور اس کے عملدرآمد کا فقدان ہے، چنانچہ اس باب کے مقاصد کے خاطر، جے جے ایس او کا جائزہ لینا زیادہ فائدہ مند ہے تاکہ پاکستان میں بچوں کے نظام انصاف کو درپیش مسائل کا تجزیہ کیا جاسکے۔ جے جے ایس اے کے نفاذ کے دوران جے جے ایس او کے بہت سے مسائل دوبارہ وقوع پذیر ہونے کا امکان ہے کیونکہ یہ قانون کے حروف سے متعلقہ مسائل کی بجائے ادارتی اور ڈھانچہ جاتی مسائل ہیں۔

ب۔ بچوں کا نظام انصاف آرڈیننس 2000ء: جائزہ

بچوں کا نظام انصاف آرڈیننس 2000ء کا قانون 'فوجداری مقدمہ بازی میں بچوں کے تحفظ، معاشرے میں ان کی آبادکاری، بچوں کی عدالتوں کی تنظیم نو' کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس قانون میں فوجداری مقدمہ بازی میں ملوث 18 سال سے کم عمر بچوں کے لیے الگ اور مضبوط حفاظتی اقدامات بیان کیے گئے ہیں تاکہ انہیں آباد کیا جاسکے اور معاشرے میں دوبارہ شامل کیا جاسکے۔ قانون میں مندرجہ ذیل اہم حفاظتی اقدامات فراہم کیے گئے ہیں:

- کم سن مجرموں کو موت کی سزا دینے یا ان کی قید کے دوران ان سے مشقت لینے کی ممانعت (سیکشن 12)۔
- بچوں کی خصوصی عدالتوں کا قیام جنہیں کم سن افراد کے مقدمات کی سماعت کا خصوصی اختیار حاصل ہو۔
- بچے کے کسی بالغ فرد کے ساتھ مشترکہ ٹرائل کی ممانعت (سیکشن 12)۔
- کسی بھی عام ذرائع جیسے کہ اخبارات، میگزین، جریدے میں بچے کی شناخت ظاہر کرنے سے تحفظ (سیکشن 13)
- کم سن مجرموں کے لیے ریاست کے خرچ پر قانونی امداد کا حق۔ ایسی قانونی امداد کسی ایسے وکیل کی جانب سے دی جانی چاہئے جو بار میں کم از کم 5 سال کا تجربہ رکھتا ہو۔
- گرفتار کرنے والے افسر کی ذمہ داری ہے کہ وہ گرفتاری کے بعد جتنا جلد ممکن ہوسکے، گرفتار کیے گئے بچے کے سرپرست کو بچے کی گرفتاری اور بچوں کی عدالت، جس میں بچے کو پیش کیا جائے گا، سے متعلق تفصیلات سے آگاہ کرے (سیکشن 5)۔
- کسی ایسے بچے کے لیے جسے بچوں کی عدالت نے سزا سنائی ہو، سرپرست کی نگرانی میں رہا کیے جانے کا امکان۔

تاہم، جے جے ایس او اپنے نفاذ کے بعد سے عملدرآمد اور سیاسی عزم کی کمی جیسے مسائل کا شکار رہا ہے۔ 2004ء میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک فل بنچ نے جے جے ایس او کو 'غیر مناسب، غیر آئینی اور ناقابل عمل' قرار دیا اور اسے فوری طور پر منسوخ کردیا۔ عدالت نے درخواست گزار کی اس دلیل کو تسلیم کیا جس میں اس نے کہا تھا کہ جے جے ایس او غیر آئینی تھا کیونکہ اس میں کم سن بچوں کو حد سے زیادہ تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ فروری 2005ء میں، سپریم کورٹ نے وفاقی حکومت اور بچوں کے حقوق کے تحفظ کی سوسائٹی (سپارک) کی جانب سے 2004ء کے فیصلے کے خلاف دائر کی گئی اپیلوں کو منظور کرلیا اور اس پر ایک حکم امتناعی جاری کیا، اور مقدمے سے متعلق حتمی فیصلے کو ملتوی کردیا۔ یہ مقدمہ جے جے ایس او کے تنسیخ تک زیرالتوا رہا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون اپنی تمام تر مدت تک نظرانداز رہا۔

ج۔ بچوں سے متعلق حفاظتی اقدامات پر عملدرآمد کا فقدان

جے جے ایس او کی 18 سالہ مدت کے دوران، حکومت پاکستان اس کی دفعات پر عملدرآمد میں مسلسل ناکام رہی اور جیسا کے نفاذ کے بعد سے یہی صورتحال برقرار ہے۔ کم سن مجرموں کے ساتھ عادی مجرموں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ملک میں پیدائش کے اندراج کی مایوس کن شرح کے پیش نظر، گرفتار ہونے والے کم سن مجرموں کے پاس کسی قسم کی شناختی دستاویزات نہیں ہوتیں۔ پاکستان کے پولیس افسران بھی عام طور پر قانونی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ایسے دستاویزات کی عدم موجودگی میں اپنی عمر کا تعین کرنے کی ذمہ داری سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر، ٹرائل کے مرحلے پر کم عمری کی استدعا کیے جانے تک بچوں کو بالغوں کے ساتھ قید رکھا جاتا ہے۔ کم سن مجرموں کو پولیس کی جانب سے شدید تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ جبر کے ذریعے ان سے اقبال جرم کرا سکے۔ یہ اقبال جرم بالآخر سزایابی اور سزائے موت کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جسٹس پراجیکٹ پاکستان اور ڑیل لاء اسکول کے اشتراک سے منعقد ہونے والی تحقیق میں، الارڈ لوئیسٹن انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کلینک نے 1867 طبعی و قانونی سرٹیفکیٹس (ایم ایل سیز) کے نمونے میں سے بچوں پر تشدد کے 58 واقعات قلمبند کیے۔

پاکستان بچوں کو قانونی امداد فراہم کرنے میں بھی ناکام رہا، باوجود اس کے کہ اس حق کی جے جے ایس او اور جے جے ایس اے کے تحت ضمانت دی گئی ہے۔ صوبائی حکومتوں کی جانب سے اس حق کی فراہمی کے لیے تشکیل دیے گئے وکلاء کے پینلز بجٹ مختص نہ کیے جانے کے باعث غیر مؤثر ہیں جس کا نتیجہ برائے نام معاوضے کی شکل میں نکلا ہے۔ یونیسف کے اندازوں کے مطابق، قابل ضمانت جرائم کے مرتکب تقریباً 89 فیصد بچے خاص طور پر اس وجہ سے جیل میں ہیں کیونکہ وہ وکیل کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ قانونی امداد کی کمی کا یہ بھی مطلب ہے کہ تفتیش اور سماعت کے دوران کم سن افراد کی جانب سے اپنی کم عمری کی استدعا کیے جانے کا امکان کم ہوجاتا ہے، اور اسی لیے وہ جے جے ایس او کے دائرے سے باہر رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں، عدالتوں کی جانب سیاپیلوں یا بعد از سزا نظرثانی کے دوران کم عمری سے متعلق درخواستیں قبول کیے جانے کا امکان انتہائی کم ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لاتعداد کم سن مجرم سزائے موت اور پھانسی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

جے جے ایس او اور جے جے ایس اے کے تحت عائد تمام صوبوں میں بچوں کی الگ عدالتوں کے قیام کی واضح ذمہ داری کے باوجود، پاکستان میں بچوں کی واحد عدالت دسمبر 2017ء میں لاہور میں قائم کی گئی جو اب تک کی بچوں کی واحد فعال عدالت ہے۔ زیادہ تر واقعات میں، حکومت ضلعی و سیشن ججوں، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں، سینیئر سول ججوں اور عدالتی مجسٹریٹس کو بچوں کی خصوصی عدالتوں کے طور پر مطلع کرتے ہوئے کم سن افرد کے لیے الگ عدالتوں کے قیام کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی لیے، باقاعدہ جج اپنی معمول کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ بچوں کے ججوں کے طور پر کام کرنے کے بھی مجاز ہیں۔ تاہم، 'بچوں کے جج' مقرر کیے گئے جج کو بمشکل ہی کوئی اضافی تربیت دی جاتی ہے تاکہ انہیں حساس بنایا جاسکے کہ انہیں کم سن مجرموں کے ساتھ ایک ایسے طریقے سے کیسے برتاؤ کرنا ہے جو

انسانی حقوق کے معیارات کے مطابق ہو۔ علاوہ ازیں، مقرر کی گئی عدالتیں جے جے ایس او اور جے جے ایس اے کے تحت فراہم کیے گئے حفاظتی اصولوں کی پابندی نہیں کرتیں—عدالتیں عوام کے لیے کھلی رہتی ہیں اور بچوں کے مقدمات کی سماعت بالغوں کے مقدمات کے ساتھ ہی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ، بچوں کے جج پر اکثر کام کا بوجھ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں عدالتی عمل سست ہو جاتا ہے جو بچوں کو بالغوں سے بھی زیادہ عرصے تک زیر حراست رکھنے کا باعث بنتا ہے۔

جے جے ایس او اور جے جے ایس اے کی دفعات کے باوجود، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں کسی قسم کے خصوصی حراستی مراکز یا بچوں کی اصلاح کے ادارے قائم نہیں کیے گئے۔ ملک کے سب سے زیادہ آبادی والے صوبے پنجاب میں بچوں کی اصلاح کے صرف دو جبکہ سندھ میں چار ادارے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کے بچوں کی اصلاح کے ادارے غیر مناسب حالات میں کام کر رہے ہیں اور یہ دونوں صوبوں کی جیل انتظامیہ کے ذریعے چلائے جاتے ہیں جو حراست کے دوران بچوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے غیر تربیت یافتہ ہیں۔

III۔ بچوں کے انصاف سے متعلق قانونی فریم ورک مؤثر بہ ماضی نہیں ہے:

جے جے ایس او کو مؤثر بہ ماضی نہیں بنایا گیا۔ اسی لیے، 2001ء سے پہلے موت کی سزا پانے والے کم سن مجرم سزائے موت سے تحفظ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تاہم، صدر پاکستان نے آئین پاکستان 1973ء کے آرٹیکل 45 کے تحت اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے نوٹیفکیشن نمبر F.B/41/ptns.2001 بتاریخ 13.12.2001 جاری کیا۔ اس نوٹیفکیشن کے تحت آرٹیکل 45 کے تحت سزائے موت پانے والے ان تمام بچوں کی سزا میں کمی کی جانی تھی جن کی سزاؤں کی توثیق ہائی کورٹ نے 17 دسمبر 2001ء سے پہلے کی تھی، اور ان کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کی جانی تھی۔ صدارتی نوٹیفکیشن کے متعلقہ حصے میں کہا گیا ہے کہ:

'سزائے موت کے ایسے قیدی جو جرم کے ارتکاب کے وقت، بچوں کا نظام انصاف آرڈیننس 2000ء میں بیان کی گئی تعریف کے مطابق، کم سن تھے کی سزا عمر قید میں تبدیل شدہ متصور ہوگی۔ مگر شرط یہ ہے کہ موت کی سزا قصاص یا دیگر حدود قوانین کے تحت نہیں بلکہ تعزیر کے تحت سنائی گئی ہو'۔

نوٹیفکیشن کے تحت، سزائے موت کی عمر قید کی سزا میں تبدیلی کی رعایت عمر سے متعلق کی جانے والی تحقیقات کی بنیاد پر دی جانی تھی۔ یہ تحقیقات اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ایک ایگزیکٹیو کمیٹی کے ذریعے انجام دی جانی تھیں۔ ایگزیکٹیو کمیٹی 'ایک ماہر، سیکریٹری داخلہ، آئی جی جیل خانہ جات اور اس جیل کے سپرنٹنڈنٹ پر مشتمل ہونا تھی جہاں سزائے موت کے قیدی کو رکھا گیا تھا'۔

تاہم، اس نوٹیفکیشن کی کارروائی بعد ازاں سپریم کورٹ میں ضیاء اللہ بنام نجیب اللہ پی ایل ڈی 2003 ایس سی 656) نامی مقدمے کا موضوع بن گئی۔ عدالت نے قرار دیا کہ:

'صدر پاکستان نے ان کم سن مجرموں کے لیے خصوصی رعایت کی اجازت دی ہچن کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم تھی اور وہ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔۔۔ اور ہم قرار دیتے ہیں کہ سیکریٹری داخلہ، حکومت کی جانب سے ملزم کی عمر کے تعین کے لیے قائم کی گئی کمیٹی۔۔۔ قانونی طور پر ایسا کرنے کی مجاز نہیں۔۔۔ یہ معاملات متعلقہ سیشن جج کے سپرد کیے جا سکتے ہیں جو بچوں کی عدالت کے اختیارات بھی استعمال کرتا ہے'۔

سپریم کورٹ نے موقف اختیار کیا کہ جے جے ایس او کے سیکشن 7 کے حوالے سے عمر کے تعین سے متعلق سوالات کا فیصلہ صرف کوئی عدالتی فورم ہی کر سکتا ہے کیونکہ یہ حقائق کا معاملہ ہے جو کسی کم سن مجرم کے ساتھ برتاؤ کے مقاصد کی خاطر عدالتی طور پر طے کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ کوئی ایگزیکٹیو کمیٹی اس عدالتی عمل کی انجام دہی نہیں کر سکتی'۔

18 اگست 2003ء کو، حکومت پنجاب نے لاہور ہائی کورٹ کے رجسٹرار کو ایک خط بھیجا جس کا مقصد صدارتی نوٹیفکیشن کے تحت بچوں کے لیے خصوصی رعایت کے لیے اہلیت کا معیار طے کرنا تھا۔ خط میں کہا گیا کہ وہ تمام کم سن مجرم خصوصی رعایت کے حق دار تھے جب کی سزائے موت کی توثیق ہائی کورٹ نے 17 دسمبر 2001ء سے پہلی کی تھی۔ خط میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ رعایت کا عمل خود بخود انجام پانا تھا اور آئین کے آرٹیکل 45 کے تحت اس کے لیے رحم کی اپیل دائر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خط کے ساتھ ان بچوں کی ایک فہرست منسلک تھی جن کے حوالے سے محکمہ داخلہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ان بچوں کے دعوے متعلقہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے 'متعلقہ ضلعی اور سیشن ججوں/ بچوں کی عدالت' کو بھیجے۔ علاوہ ازیں، خط میں تمام جیلوں کے سپرنٹنڈنٹس کو ہدایت کی گئی کہ وہ نوٹیفکیشن کے تحت خصوصی رعایت کا دعویٰ کرنے والے سزائے موت کے قیدیوں کو مطلع کریں کہ وہ متعلقہ عدالتوں سے رجوع کریں۔ جیلوں کے سپرنٹنڈنٹس کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ وہ محکمہ داخلہ کو عدالت کے فیصلے سے آگاہ کریں۔

2004ء میں لاہور ہائی کورٹ نے صدارتی حکم کی توثیق کر دی۔ اس نے حکم جاری کیا کہ موت کی سزا کا سامنا کرنے والا بچہ، جس کے مقدمے کا جیسو کے نفاذ سے پہلے فیصلہ کیا جا چکا تھا، اب بھی جیسو کے تحفظ کا حق دار ہے۔ اس نے تمام مقدمات میں جے جے ایس او کے مؤثر بہ ماضی ہونے کے بارے میں استفسار کیا، ان مقدمات میں بھی جہاں اعلیٰ عدالتوں نے موت کی سزاؤں کی توثیق کی تھی۔ اس فیصلے کا تعلق سکندر حیات اور جمشید علی سے تھا جن کی عمر مبینہ قتل کے وقت 18 سال سے کم تھی اور جن کے ڈیتھ وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ جہلم، جہاں ان بچوں کا ٹرائل ہوا تھا، کے ضلعی و سیشن جج نے سزائے موت کو تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ سپریم کورٹ سزائے موت کی توثیق کر چکی تھی۔

نوٹیفکیشن اور پنجاب حکومت کے خط کی موجودگی کے باوجود، جے جے ایس اے کے نفاذ سے پہلے سزا پانے والے بچوں کو اس قانون کے تحفظ سے محروم رکھا جاتا رہا۔ قیدیوں/ خاندانوں کی جانب سے صدارتی نوٹیفکیشن کے تحت دائر کی گئیں درخواستوں کو صوبائی داخلہ محکمہ جات اور عدالتوں کی جانب سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس میں ان قیدیوں کی جانب سے کی گئیں درخواستیں شامل ہیں جن کے نام حکومت پنجاب کے محکمہ داخلہ کے 18 اگست 2003ء کے خط سے منسلک فہرست میں درج تھے۔ مقدمات کے جائزے کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ محکمہ جات داخلہ اور سیشن جج جو اس نوٹیفکیشن کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں، اس نوٹیفکیشن کے اثرات سے یکسر نابلد ہیں۔ سیشن جج اپیلیٹ کم عمری کی حمایت میں موجود مستند شواہد کے باوجود اپیلیٹ عدالتوں کے فیصلوں کو بدلنے سے غیر متغیر طور پر انکار کر دیتے ہیں۔

عدالتیں جے جے ایس او کے نفاذ سے پہلے سزا پانے والے بچوں کی عمر کے تعین سے متعلق درخواستوں کو اس بناء پر تواتر سے مسترد کرتی ہیں کہ اپیلوں کے خارج ہونے کے سبب عمر کا سوال پر دوبارہ کارروائی نہیں کی جا سکتی، یا اس بھی بدتر یہ کہ کم عمری سے متعلق صرف تفتیش یا ٹرائل کے وقت دائر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ، ملزمان اکثر ایک ناممکن صورتحال سے دوچار رہتے ہیں، یعنی ان کے مقدمات کی عدالتی کارروائی کے وقت جے جے ایس او موجود نہیں تھا اور اب وہ اس پر انحصار نہیں کر سکتے کیونکہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

محمد انور کو 1998ء میں ایک ایسے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی جس کا مبینہ ارتکاب اس نے اس وقت کیا تھا جب وہ صرف 17 سال کا تھا۔ 2001ء کی خصوصی رعایت کے بعد، اس کے خاندان نے محکمہ داخلہ کو ایک درخواست جمع کرائی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اسے عمر کی بنیاد پر خصوصی رعایت دی جائے۔ اگرچہ محکمہ داخلہ نے عمر کے تعین کے لیے تحقیقات کا

آغاز کیا— جس میں پیدائش کے موجودہ ریکارڈ اکٹھے کیے گئے جو ظاہر کرتے تھے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت انور کم سن تھا تاہم مذکورہ بالا ضیاء اللہ مقدمے کے فیصلے کی وجہ سے یہ تحقیقات کبھی بھی مکمل نہ ہوسکیں۔ تب سے، انور کا خاندان سیشن کورٹ سے یہ درخواست کرنے کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کر چکا ہے کہ وہ اس کی عمر کا تعین کرے، اور اس کے لیے یہ کم از کم چار درخواستیں جمع کرا چکا ہے۔ تاہم، ڈیڑھ عشرے سے زائد عرصے کے دوران، کسی بھی فورم نے اس معاملے پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ دسمبر 2014ء میں، انور علی پھانسی سے محض چند گھنٹے دور تھا اور اسے پھانسی کا ایک اور وارنٹ جاری کیے جانے کا شدید خطرہ موجود ہے۔

ایک اور کم سن مجرم محمد اعظم تھا جسے 1998ء میں قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا اور اسے جے جے ایس او کے نفاذ سے پہلے 8 جولائی 1999ء کو انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے سزائے موت سنائی تھی۔ اس کے پیدائش کے ریکارڈ، جیل کے ریکارڈ کی نقول، بشمول پیدائشی دستاویز کی نقل سب ظاہر کرتیہیں کہ جب اسے حراست میں لیا گیا تو وہ 17 سال کا تھا۔ اس کے جیل ریکارڈ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اعظم کو ابتدائی طور پر کم سن مجرموں کے لیے خصوصی طور پر ڈیزائن کیے گئے بچوں کی اصلاح کے ادارے 'یوتھ فُل اوفینڈرز انڈسٹریل اسکول کراچی' میں رکھا گیا تھا۔ 2001ء کے نوٹیفکیشن کے بعد جیل حکام نے 9 اگست 2004ء کو سماعت کی عدالت کو ایک درخواست بھیجی جس میں عدالت سے استدعا کی گئی کہ محمد اعظم کی عمر کا تعین کیا جائے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا اس کی سزا تبدیل کی جانی چاہئے یا نہیں۔ تاہم عدالت نے اس درخواست کو اس بناء پر مسترد کردیا کہ ٹرائل کے پورے عرصے کے دوران بلوغت سے متعلق کوئی استدعا نہیں کی گئی اور یہ کہ سماعت کی عدالت اپیلوں کے فیصلے کے بعد مجاز نہیں رہی تھی۔

IV۔ بچوں کے لیے حفاظتی اقدامات کا دہشت گردی سے متعلق ٹرائلز پر اطلاق نہیں کیا گیا:

جے جے ایس او کے آرٹیکل 14 کے مطابق، اس قانون نے دیگر قوانین کے منسوخ نہیں کیا بلکہ اس کا 'ان کے علاوہ' اطلاق ہوتا ہے۔ تاہم، یہ آرڈیننس بچوں کی عدالتوں کو 'ان مقدمات کے ٹرائل کا خصوصی اختیار دیتا ہے جن میں کوئی بچہ کسی بھی جرم کا مرتکب پایا گیا ہو۔' اس تضاد کے پیش نظر، سپریم کورٹ کا اصولِ قانون ان جرائم کے حوالے سے بچوں کی عدالتوں کے دائرہ اختیار کا مسئلہ یکساں طور پر حل کرنے میں ناکام رہا تھا جن کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی تھیں، خاص کر انسداد دہشت گردی کی عدالتیں۔ اس کے نتیجے میں، خصوصی عدالتوں، جن کے طریق کار منصفانہ ٹرائل کے بین الاقوامی معیارات پر پورا اترنے میں ناکام رہتے ہیں، نے بچوں کا بالغوں کے طور پر ٹرائل کرنے اور انہیں پھانسی کی سزائیں دینے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ (آٹا) 1997ء میں وضع کیا گیا تھا جو دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث افراد کا ٹرائل کرنے کے لیے انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کے قیام کا اہتمام کرتا ہے، اور ان ٹرائلز کی انجام دہی کے لیے خصوصی طریق کار تشکیل دیتا ہے جو اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت 'دہشت گردی کی کارروائیوں' کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس میں ریپ اور بھتے جیسے جرائم شامل ہیں جو 'خوف پیدا کر سکتے ہیں یا لوگوں یا لوگوں کے کسی حلقے میں خوف اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کر سکتے ہوں۔'

سیکشن 32 کے تحت، اے ٹی اے کو ان تمام قوانین سے زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں جو اس وقت نافذ العمل ہیں۔ اے ٹی اے کی سیکشن 32 اور جے جے ایس او کے سیکشن 14 کو ساتھ ملا کر پڑھتے ہوئے، عدالتوں نے دفعات کی جو تشریح کی اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ اے ٹی اے کے تحت دہشت گردی سے متعلق جرائم اور حتیٰ کہ کم عمر مجرموں کے حوالے سے بھی خصوصی دائرہ اختیار کی حامل ہیں۔ اسد اللہ بنام ریاست میں سندھ ہائی کورٹ نے تسلیم کیا کہ اے ٹی اے قرار دیتا ہے کہ 'جے جے ایس او کا سیکشن 14 اس نقطہ نظر کو تقویت دیتا ہے کہ عمر کی حد یا مجرموں کے کسی اور درجے سے قطع نظر، اے ٹی اے کے تحت قائم کی گئی عدالت شیڈولڈ جرائم کے حوالے سے خصوصی دائرہ اختیار کی حامل ہے۔'

یہ قرار دیا گیا کہ کم عمر مجرم کے لیے لازمی سزائے موت کے حوالے سے کسی قسم کی تلافی یا رعایت فراہم نہیں ہونی چاہئے۔ قمر حسین شاہ بنام ریاست مقدمے میں عدالت نے قرار دیا کہ اے ٹی اے کے تحت مجرم قرار دیے گئے بچے کو انسداد دہشت گردی کی عدالت سزا سنائے گی نہ کہ بچوں کی عدالت۔ سندھ ہائی کورٹ کے ایک فُل بنچ نے حکم جاری کیا کہ انسداد دہشت گردی کی عدالت بچوں کی عدالتوں کے لیے درکار طریقہ کار کی قواعد کی پابند نہیں ہوگی۔

انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی جانب سے کیے گئے ٹرائلز تیز رفتار تفتیش اور عدالتی کارروائیوں کے تحت انجام دیے جاتے ہیں اور یہ عمل سات دنوں میں مکمل کرنا لازمی ہے۔ تفتیش کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی لازمی مدت کے علاوہ، اے ٹی اے ضابطے سے متعلق اہم حفاظتی اقدامات کو منسوخ کر دیتا ہے جس سے تشدد کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اے ٹی اے کا سیکشن 21(h) ڈی ایس پی سے اوپر کے درجے کے پولیس افسر کے سامنے کیے گئے اقبال جرم کو ملزم کے خلاف ثبوت کے طور پر قبول کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس سے پولیس کو مشتبہ افراد پر تشدد کے ذریعے جھوٹا اقبال جرم کرانے کا لائسنس مل جاتا ہے۔ بچوں کا ان کی غیر محفوظ حالت کی بناء پر ناروا سلوک کا نشانہ بننے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

اسی طرح، ٹرائل کی تکمیل کے لے مقرر کردہ وقت اتنا کم ہے کہ مدعا علیان کو اپنے دفاع کی مناسب تیاری کا وقت نہیں ملتا جیسا کہ عالمی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق کے آرٹیکل 14(3) میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، اگرچہ جے جے ایس او کم سن مجرموں کے لیے سزائے موت کی ممانعت کرتا ہے، اے ٹی اے ان افراد کے لیے سزائے موت کو لازمی قرار دیتا ہے جو دہشت گردی کی ایسی کارروائی کے مرتکب پائے گئے ہوں جس کے نتیجے میں ایک یا ایک سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے ہوں۔

مذکور بالا باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، نئے جے جے ایس اے کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ایک اس کا سیکشن 23 ہے جو کہتا ہے کہ 'فی الوقت نافذ العمل کسی اور قانون میں مذکور کسی امر کے باوجود، اس ایکٹ کی دفعات دیگر تمام قوانین سے زیادہ مؤثر ہوں گی'۔ اس سے اس قانون کو دیگر نافذ العمل قوانین پر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے، اور یوں جے جے ایس اے کم عمر مجرموں کے مقدمات نبٹاتے وقت اے ٹی اے پر بالادستی حاصل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ، پاکستانی قانون میں پائے جانے والے ابہام اور تضاد کو بے ضابطہ طور پر دور کیا گیا ہے اور قانون کی ایسی خامیاں جو کم عمر مجرموں کو سزائے موت کے خطرے سے دوچار کرتی ہیں دور کردی گئی ہیں۔

ماحصل اور سفارشات

سابقہ بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حکومت پاکستان بین الاقوامی فورم پر اس بات پر مصر رہی ہے کہ ملک میں کسی بھی کم سن فرد کو پھانسی نہیں دی گئی، اس نے اپنے بین الاقوامی عہد و پیماں کی خلاف ورزی کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے، چونکہ یہ بچوں کے نظام انصاف کے موجودہ قانونی فریم ورک میں پائی جانے والے جبلی ڈھانچہ جاتی مسائل کی نشاندہی میں ناکام رہی ہے۔ جب تک بنیادی مسائل بشمول پیدائش کا اندراج، عمر کے طریق ہائے کار اور بچوں کے قانون کے دیگر قوانین سے مقدم ہونے کے اثرات کی کمی جیسے مسائل کو حل نہیں کیا جاتا، بچوں کے انصاف کا موجودہ نظام بین الاقوامی معیارات پر پورا نہیں اتر سکے گا، بالخصوص اس لیے کہ یہ کم سن مجرموں سے متعلق حفاظتی اقدامات کی نشاندہی اور ان حفاظتی اقدامات کی کم عمر مجرموں کو

فراہمی میں مسلسل ناکام رہا ہے اور یوں اس نے ان کی پھانسیوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

یہ بنیادی ناکامیاں اور انسانی حقوق کی بین الاقوامی ذمہ داریاں اس بات کی متقاضی ہیں کہ حکومت پاکستان مندرجہ ذیل اقدامات کرے:

الف۔ سزائے موت پر پابندی دوبارہ بحال کی جائے اور ان مقدمات کی تحقیقات کی جائے جن میں کم عمری کا شبہ ہو:

حکومت پاکستان کو سزائے موت پر پابندی دوبارہ بحال کرنی چاہئے اور مزید ڈیتھ وارنٹ جاری کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ سزائے موت پر پابندی عائد کیے جانے کے بعد، سزائے موت کے منتظران قیدیوں کو قومی کمیشن برائے انسانی حقوق اور انسانی حقوق کی صوبائی باڈیز بشمول سندھ انسانی حقوق کمیشن کو درخواست درج کرانے کا موقع ملنا چاہئے جن کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ مبینہ جرم کے ارتکاب کے وقت وہ کم سن تھے۔ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق اور صوبائی باڈیز کو اس کے بعد فراہم کردہ شواہد کا ظاہری معائنہ کرنا چاہئے۔ ایسے مقدمات کو، جہاں یہ سمجھا جاتا ہو کہ کم عمری کی حمایت میں خاطر خواہ شواہد مہیا کیے گئے ہیں، جے جے ایس او کے سیکشن 7 کے تحت عمر کے تعین سے متعلق کارروائی کے لیے سیشن عدالتوں کو بھیجا جانا چاہئے۔ سیشن عدالت کو یقینی بنانا چاہئے کہ یہ کارروائیاں عمر کے تعین کے بین الاقوامی پروٹوکولز (جس کا نیچے ذکر کیا گیا ہے) سے مطابقت رکھتی ہوں اور قومی کمشین برائے انسانی حقوق کو ایسے کارروائیوں میں بطور فریق شامل کیا جائے۔ اگر ان کارروائیوں کے نتیجے میں یہ اس بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ قیدی ایک کم عمر مجرم تھا تو اسے رحم کی ایک اور درخواست دائر کیے بغیر خود کار تلافی فراہم کی جائے۔

ب۔ عمر کے تعین سے متعلق پروٹوکول کا قیام اور نفاذ کیا جائے

گرفتاری، ٹرائل، اپیل، اور بعد از سزا جائزے کی سطح پر عمر کے تعین سے متعلق پروٹوکول تشکیل دیے جائیں تا کہ عدالتی کارروائی کے ہر مرحلے پر عمر ریکارڈ کرنے کا طریقہ کار مقرر کیا جا سکے۔ ان پروٹوکولز کا نوٹیفکیشن وزارت انسانی حقوق کو قومی اور صوبائی پولیس اور عدالتی اکیڈمیوں کو جاری کرنا چاہئے اور انہیں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ضوابط کا حصہ بنایا جانا چاہئے۔ ان پروٹوکولز کو:

- یقینی بنانا چاہئے کہ گرفتاری کے وقت پولیس افسران اس وقت عمر ریکارڈ نہ کریں جب تک کہ ریکارڈ کی گئی عمر کی بنیاد شناختی دستاویزات پر نہ ہو اور ملزم نے اس کی تصدیق کی ہو۔ اگر ایسی دستاویزات دستیاب نہ ہوں، اگر ملزم نے دستاویزات میں درج عمر پر اعتراض کیا ہو، یا اگر ملزم کی عمر کی حوالے سے کوئی شک پایا جاتا ہو تو پولیس کو اسے تحریری طور پر ریکارڈ کرنا چاہئے اور عمر کے تعین کے مکمل جائزے کی درخواست کرنی چاہئے۔ اس جائزے کا انعقاد مجاز بچوں کے جج کو کرنا چاہئے۔
- واضح کرنا چاہئے کہ عمر کے تعین کیعمل کا پہلا مرحلہ ملزم کی عمر اور شناخت سے متعلق تمام سرکاری دستاویزات کی جانچ پڑتال ہونا چاہئے۔ جہاں ایسی دستاویزات جاری کی گئی ہوں جو مبینہ جرم کے ارتکاب کے وقت ملزم کی عمر سے متعلق اس کے اپنے بیان کی تصدیق کرتی ہو تو ان دستاویزات کو درست تصور کیا جائے۔
- واضح کرنا چاہئے کہ ایسے مقدمات جہاں حکومت کی جاری کردہ دستاویزات کی تصدیق کے حوالے سے کوئی شبہ پایا جاتا ہو، یا جہاں حکومت کی جاری کردہ دستاویزات میں کوئی تضاد موجود ہو، تو متعلقہ گواہ کے معائنے پر مبنی ایک نفسیاتی و سماجی تفتیش کا انعقاد کیا جائے۔ متعلقہ گواہان میں ملزم، اس کا خاندان، یا ایسا کوئی بھی شخص شامل ہے جو اس کی پیدائش کے وقت وہاں موجود ہو جیسے کہ ڈاکٹر یا دائی، اور اس کی مقامی کمیونٹی کے اراکین۔
- اس حقیقت کو واضح طور پر سامنے رکھنا چاہئے کہ ملزم کی عمر سے متعلق میڈیکل شواہد اکثر غیر جامع ہوتے ہیں اور انہیں دستاویزی ثبوت یا ایک مکمل نفسیاتی و سماجی تفتیش پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔
- یہ یقینی بنانا چاہئے کہ جہاں، عمر کے تعین کیا ایسے عمل کے بعد، جس میں اوپر بیان کیے گئے مراحل شامل ہوں، ملزم کی عمر کے حوالے سے کوئی شک باقی رہ جائے تو ایسا شک ملزم کے حق میں جانا چاہئے اور عدالت کو اس بات کا تعین کرنا چاہئے کہ اس فرد کو قانون کے برعکس بچہ تصور کیا جائے۔
- اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ عمر کے تعین کے جائزے کا انعقاد ایسے کسی بھی مرحلے پر کیا جائے جب کم عمری کا معاملہ اٹھایا گیا ہو، حتیٰ کہ اپیل سے متعلق عام کارروائیاں ختم ہو جانے کے بعد بھی۔ ایسا کوئی بھی مقدمہ جس میں کم عمری کے حوالے سے کوئی بادی النظر ثبوت پیش کیا گیا ہو تو ان پروٹوکولز کی مطابقت میں ایک مکمل عدالتی تحقیقات کا انعقاد کیا جائے۔ اگر ایسی تحقیقات کے بعد، عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ملزم قانون کے برعکس اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے ساتھ بچے کے طور پر برتاؤ کیا جائے تو سزائے موت، اگر پہلے دی گئی ہو، کو عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے۔ جہاں مناسب ہو، دوبارہ ٹرائل کا حکم دیا جا سکتا ہے اور ایسا ٹرائل بچوں کے نظام انصاف کی دفعات کی مطابقت میں ہونا چاہئے۔

ج۔ نئے شواہد کی بنیاد پر بعد از سزا جائزے قبول کیے جائیں

اگرچہ حکومت پاکستان نے آئی سی سی پی آر کے تحت اپنی ابتدائی رپورٹس میں دعویٰ کیا ہے کہ سپریم کورٹ کو بے گناہی یا کم عمری سے متعلق بری الذمہ قرار دینے والے شواہد کی بنیاد پر بعد از سزا جائزوں کو قبول کرنے کا اختیار رکھتی ہے، تاہم عدالتیں ان کارروائیوں کو زائد المعیاد ہونے کی بناء ▯ پر دوبارہ شروع کرنے سے انکار کرتی رہی ہیں۔ حکومت پاکستان کو یقینی بنانا چاہئے کہ ادارہ جاتی تلافی—انتظامی یا عدالتی—ان ملزموں کے لیے دستیاب ہو جن کے مقدمات میں ایسے نئے شواہد سامنے آئے ہوں جو اس کی سزا کو کم کر سکتے ہوں۔

د۔ سزائے موت کے منتظر بچوں کے اعداد و شمار شائع کیے جائیں

حکومت پاکستان کو سزائے موت کے منتظران قیدیوں کی کل تعداد سے متعلق کوائف جمع کرنے چاہئیں اور انہیں عوام کے لیے دستیاب بنانا چاہئے جنہیں ان جرائم میں سزا سنائی گئی ہو جن کے ارتکاب کے وقت ان کی عمر 18 سال سے کم تھی۔ اس تعداد ان قیدیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے کم عمری سے متعلق استدعا کی ہو جو بعد ازاں مسترد ہو گئی ہو۔

ہ۔ صدارتی نوٹیفکیشن پر عمل درآمد

حکومت پاکستان کو یقینی بنانا چاہئے کہ صدارتی نوٹیفکیشن نمبر Ptns-2001/41/F.8 بتاریخ 13 دسمبر 2001ء کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ نوٹیفکیشن کے تحت، صوبائی محکمہ جات برائے داخلی امور کو یقینی بنانا چاہئے کہ جے جے ایس او کے نفاذ سے پہلے سزا پانے والے تمام بچوں کی کم عمری سے متعلق تمام تحقیقات متعلقہ عدالتوں کے سپرد کی جائیں۔ عدالتوں کو ان تحقیقات کی انجام دہی عمر کے تعین کے ان طریق ہائے کار کے مطابق کرنی چاہئیں جو مندرجہ بالا بین الاقوامی معیارات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ایسے افراد جنہیں کم سن مجرم قرار دیا گیا ہو، کی سزائیں خود بخود تبدیل ہو جانی چاہیں یعنی انہیں آئین پاکستان کے آرٹیکل 45 کے تحت دوبارہ رحم کی درخواست جمع کرانے کی ضرورت نہیں۔

ریاستی تشدد: ایک طاعون

زاہدہ حنا

اقوام متحدہ کا میثاق ہو، ایمنسٹی انٹرنیشنل کی دستاویزات ہوں یا ہیومن رائٹس واچ کے متعین کردہ اصول۔ ان کی روشنی میں دیکھیں تو مختلف ملکوں میں سیاسی قیدیوں پر ہونے والے تشدد کا جو احوال ہم تک پہنچتا ہے وہ ناقابل یقین ہے۔ ان رپورٹوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ اطالوی نژاد گیورڑا نو برونو بہت یاد آتا ہے۔ شاید 65 یا 66 کے دن تھے جب میں نے پہلی مرتبہ برونو کے بارے میں پڑھا۔

1545 میں پیدا ہونے اور 1600 میں اس جہان سے گزر جانے والے اس شخص کی زندگی نے مجھے بتایا کہ انسان، انسان پر سوچے سمجھے انداز میں کس طرح وحشیانہ تشدد کر سکتا ہے۔ کس طرح جیتے جی اسے جہنم میں دھکیل سکتا ہے۔ برونو کی داستان الم انگریزی کے ایک رسالے میں شایع ہوئی تھی۔ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک دوست کی دغا بازی سے جب وہ (کیتھولک کلیسا کی عدالتِ احتساب) کے حوالے کیا گیا تو سات برس کی ہولناک قید اور مقدمے کے بعد اس کے بدن کا ایک ایک عضو کاٹا گیا۔ اس کے زخموں پر گندھک چھڑک کر آگ لگائی گئی اور جب اس کے بعد بھی اس نے کلیسا کی تابعداری سے انکار کیا تو اس کے رہے سہے بدن کو زنجیروں سے باندھ کر چیر دیا گیا۔

برونو نے اپنا علمی اور ذہنی سفر دینیات سے شروع کیا، ایک استاد کے زیر اثر ابن رشد کی تعلیمات میں دلچسپی لی، فلسفہ اور منطق پڑھی، استاد ہوا، سائنسی علوم سے اسے شغف پیدا ہوا۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک عالم فاضل انسان تھا۔ جیومیٹری اور دوسرے علوم پر کتابیں لکھیں۔ جہل ہمیشہ علم سے خوفزدہ رہتا ہے۔ کلیسا کے تاریک ذہن افراد اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ جو سوال اٹھاتا اس سے انھیں اپنی بنیادیں لرزتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اس کو ''عدالتِ احتساب'' کے شکنجے میں جکڑنا اور سزا دینا یا گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینا لازمی تھا۔ وہ اپنی سی کر گزرے لیکن برونو اپنے خیالات پر قائم رہا اور ایک اذیت ناک موت اس کا مقدر ہوئی۔ اس کی ہلاکت پڑھتے ہوئے منصور حلاج کی سولی کا خیال آیا جو تین دن پر پھیلی ہوئی تھی اور انگلیاں کترنے سے شروع ہوئی تھی۔ یہ دونوں عظیم انسان اپنے عہد کے بدباطن لوگوں کی خباثتوں کا شکار ہوئے، ان کے شکاریوں کے نام بھلا دیے گئے لیکن وہ دونوں تاریخ کے صفحوں پر زندہ ہیں۔

برونو پر چھپنے والا مضمون میں نے ترجمہ کیا جو فوراً ہی شایع ہو گیا۔ ریاستی یا مذہبی اہلکاروں کے تشدد کے خلاف اس وقت سے ذہن میں سوالات اٹھنے لگے تھے اور اس حوالے سے جاننے کی جستجو شروع ہو گئی تھی۔ یہی جستجو ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ان دوسرے اداروں کی طرف لے گئی جو دنیا کے مختلف ملکوں کے نامعلوم عقوبت خانوں میں تشدد کا شکار ہونے والوں کے حال زار کو سامنے لاتے ہیں۔ ایمنسٹی انھیں ''ضمیر کا قیدی'' قرار دے کر دنیا بھر میں ان کی رہائی کے لیے مہم چلاتی ہے۔

ہمارے یہاں بھی شاہی قلعے اور دوسرے عقوبت خانوں میں ستم سہنے والے کئی لوگ ''ضمیر کے قیدی'' قرار دیے گئے۔ ان میں حیدرآباد سازش کیس کے جعلی مقدمے میں قید جام ساقی، کمال وارثی اور بہت سے دیگر سیاسی کارکنوں کو ایمنسٹی نے ''ضمیر کا قیدی'' قرار دیا۔ جام 1988 میں جیل سے چھوٹ کر آئے تو انھوں نے جہاں مجھ سے بہت سوال کیے، وہیں میری دو کہانیوں کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا تھا کہ تمہیں تشدد سہنے والے قیدیوں سے اتنی گہری دلچسپی کیوں ہے؟

ان کہانیوں میں سے ایک ''بودوونبوو کا آشوب'' تھی، فیض صاحب نے اسے Lotus کے لیے انگریزی میں ترجمہ کیا، اس میں ایک کمیونسٹ رہنما کو فوجی ایجنسی اذیتیں دے کر ہلاک کرتی ہے اور وہ گمنام قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ حسن ناصر مرحوم پر ہونے والا ریاستی تشدد اور ان کی ہلاکت کا عکس اس کہانی میں نظر آتا ہے۔ دوسری کہانی ''جسم وزباں کی موت سے پہلے'' تھی۔ جام ساقی نے اس کے ورق پلٹتے ہوئے مجھے میرے لکھے ہوئے جملے دکھائے تھے اور پوچھا تھا کہ تم نے تہہ خانے میں بند، عقوبتیں سہتے ہوئے کسی شخص کی ذہنی حالت کیسے لکھ لی؟ یہ سب کچھ میں شاید اس لیے لکھ سکی تھی کہ برونو اور منصور حلاج پر کیا جانے والا وحشیانہ تشدد میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

یوں تو ریاستی تشدد کے خلاف اقوام متحدہ کے عالمی منشور **1948** میں بھی پابندیاں عائد کرنے کی بات کی گئی تھی لیکن یہ **10** دسمبر **1984** کا دن تھا جب تشدد کے خلاف کنونشن کا مسودہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا۔ **146** ممبر ملکوں میں سے **76** نے اس پر دستخط کیے اور **26** جون **1987** سے نافذ العمل ہوا اور جس کی توثیق صرف **20** ملکوں نے کی۔ ایسے متعدد ملک ہیں جنھوں نے ابھی تک اس دستاویز کی توثیق نہیں کی ہے۔ **1998** میں اقوام متحدہ کے اس وقت کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے ریاستی تشدد کے سامنے سپر نہ ڈالنے والوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''ہم ان لوگوں کی تعظیم کرتے ہیں جنھوں نے ناقابل یقین ستم سہے۔ ہمیں ان ستم سہنے والوں کے بارے میں اپنی زبان کھولنی چاہیے۔''

دنیا میں فراعنہ، شہنشاہوں اور بادشاہوں کے عقوبت خانے زمانہ؟ قدیم سے قائم ہیں، لیکن برونو کے دور سے گوانتاناموبے اور اس سے آگے تک ریاستی تشدد ایک طاعون کی طرح ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ اپنے مخالفین کو زیر کرنے، ان سے اپنی پسند کے ''اعترافات'' کرانے کے لیے دنیا بھر کی حکومتیں کون کون سے حربے استعمال نہیں کرتیں۔ امریکی سی آئی اے ایک عرصے سے اور بہ طور خاص افغانستان اور عراق پر حملے کے بعد سے انتہائی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ قیدیوں کو بجلی کے جھٹکے دینا، غلیظ پانی میں چہرہ ڈبونا، سر پر پلاسٹک چڑھا کر دم گھونٹنے کی کیفیت پیدا کرنا، ٹانگوں کو چیرا لگانا، جنسی بے حرمتی اور اس بے حرمتی کے لیے تربیت یافتہ کتوں کا استعمال، کئی دن تک سونے نہ دینا، دواؤں کے ذریعے قیدیوں کو ذہنی اختلال میں مبتلا کرنا۔ تشدد اور اذیت کے محض چند معروف طریقے ہیں۔

اسی حوالے سے 1947 میں ورلڈ میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی۔ جس کا سبب دوسری جنگ عظیم کے دوران قیدیوں پر کیے جانے والے تشدد کے واقعات میں بعض جرمن اور جاپانی ڈاکٹروں کی شراکت داری تھی۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات ہے کہ ڈاکٹر جو اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد پیشہ وارانہ زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے انسانوں کو درد اور تکالیف سے نجات دلانے اور اس میں رنگ ونسل، مذہب یا علاقے کی تخصیص نہ برتنے کا حلف اٹھاتے ہیں ان کی نگرانی میں قیدیوں کو اذیت ناک سزائیں دی جائیں، وہ اس بات کا ''خیال'' رکھنے پر مامور ہوں کہ تشدد صرف اس حد تک کیا جائے کہ قیدی جان سے نہ گزر جائے۔

اس بارے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اکیسویں صدی میں ایذا رسانی کے طریقوں میں کچھ کمی آئے گی اور مختلف ریاستوں میں کام کرنے والے اہلکار، ریاست کے بجائے انسانیت کا ساتھ دیں گے لیکن اکیسویں صدی کی دو دہائیاں مکمل ہو چکیں اور ایذا رسانی کی کہانی کچھ اور زیادہ پیچیدہ اور ہولناک ہو چکی ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز پر جب ہیومن رائٹس واچ نے عراق کے قید خانوں کے بارے میں ایک رپورٹ دنیا کے سامنے پیش کی تو معلوم ہوا کہ حکومت وقت سے اختلاف کرنے والوں کو زدوکوب کرنا، کلائیوں کو زنجیروں سے باندھ کر لٹکانا، آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر ہفتوں قیدیوں کو رکھنا اور ان کے نازک اعضا کو بجلی کے جھٹکے دینا، سر غلاظت بھرے حوض میں ڈبونا ایک عام سی بات ہے۔

سب سے زیادہ حیرت یہ جان کر ہوتی ہے کہ مذہب کی دعویدار ایک حکومت میں کوڑے مارنا، ہاتھوں کو کلائی پر سے اس طرح مروڑنا کہ وہ ٹوٹ جائیں اور قیدی ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائیں۔ مخالفانہ جلسوں اور جلسوں میں شرکت کرنے والی لڑکیوں اور عورتوں پر مسلسل جنسی تشدد، لڑکوں کے ساتھ بھی جنسی بدسلوکی ایک عام سی بات ہے۔

وہ لوگ جو ان شدائد سے گزرے، ان میں سے کچھ لوگ ذہنی طور پر اختلال کا شکار ہوئے اور کچھ جسمانی طور پر نیم معذور ہوئے۔ کرد خواتین اور مرد جنھوں نے اپنے لوگوں کے حق کے لیے آواز بلند کی انھیں موت کی سزا سنائی گئی اور اس سے پہلے ان پر جسمانی اور جنسی تشدد کیا گیا۔ اسرائیلی سپریم کورٹ نے قیدیوں پر ہر طرح کے تشدد کو غیر قانونی قرار دیا لیکن سپریم کورٹ کا حکم ایک طرف اور سادیت پسند جیل حکام من مانی کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ لوگ فلسطینی قیدیوں کو سونے نہیں دیتے، انھیں سگ خانے جیسی کوٹھریوں میں رکھتے ہیں۔ ٹوائلٹ میں کھانے پر مجبور کرتے ہیں اور جسمانی سزائیں دیتے ہیں۔

ہم جو یورپ اور امریکا سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ہمارے یہاں بھی ریاست، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے عقوبت خانے موجود ہیں۔ یہ خبریں بھی آتی رہتی ہیں کہ ایجنسیوں اور پولیس کے نجی ٹارچر سیل موجود ہیں جہاں جانے والے بیشتر لوگ واپس نہیں آتے۔ ہمارے سیکڑوں شہری جو لاپتہ ہوئے، ان میں سے کچھ بیرون ملک ''فروخت'' ہوئے کچھ ملک کے اندر ہی جانے کن عقوبت خانوں میں موجود ہوں گے، ان کی چیخیں ہم تک نہیں آتیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم یہ جانتے تو ہیں کہ بے شمار مجبور و بے بس لوگ سادیت پسند اور ذہنی کج روی کے شکار قاہر و جابر اہلکاروں کے چنگل میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔ کیا ہم انھیں یاد بھی نہ کریں؟ کیا ان کے لیے آواز بلند کرنا ہمارا فرض نہیں ہے؟

(بشکریہ ایکسپریس اردو)

پاکستانی جیلوں میں قیدی اور نظام انصاف

زمان خان

پچھلی صدی کی ستر کی دہائی میں پیپلز پارٹی کے ایک وزیر ملک حاکمین خان ہوتے ان کے نام سے ایک بیان منصوب ہوگیا کہ ہم پنجاب میں جیلوں کا جال بچھادیں گے۔ یارلوگوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا مگر آج لگتا ہے کہ وہ کتنے دور اندیش تھے۔

اسلام آباد ہاءء کورٹ میں ایک کیس کی سماعت کے دوران وفاقی وزیر برائے انسانی حقوق شیریں مزاری نے رضا کارانہ بیان میں بتایا کہ پاکستان بھر کی جیلوں میں اس وقت 80145 قیدی ہیں جبکہ جیلوں میں 56495 قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہے۔ قیدیون کی تفسیلات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ 5189 قیدی مہلک بیماریوں کا شکار ہیں۔ جن میں قیدی ایڈز اور ہیپاٹائٹس جیسی مہلک بیماریوں میں بھی مبتلا ہیں۔ 600 کے قریب ذہنی مریض ہین۔ ہر صوبہ میں قیدیوں کے اعداد و شمار بتاتے ہوئے انہوں نے پتایا کہ پنجاب کی جیلیوں میں گنجائش 25056 قیدیوں کی ہے جبکہ پنجاب کی جیلوں میں 45326 قیدی ہیں ،ہ۔ سندھ میں گنجائش 11488 قیدیوں کی ہے جبکہ قیدی 16315 ہیں۔ خیبر پختون خوا میں گنجائش 7067 قیدیوں کی ہے جبکہ قیدی 9960 ہیں۔ بلوچستان میں گنجائش 1244 قیدیوں کی ہے جبکہ قیدی 2122 ہیں۔

ہماری جیلوں میں دو قسم کے قیدی ہیں—ایک وہ جنہیں عدالتوں کے ذریعہ سزا ہوچکی اور عدالت کے حکم پر قید کاٹ رہے ہیں اور دوسرے قیدی وہ ہیں جن کے مقدمات زیر سماعت ہیں جنہیں انڈر ٹرائیل پرزنرز کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہمارا میڈیا اس خبر پر مذاکرے کراتا، اخبارات ایڈیٹوریل لکھتے مگر بدقسمتی سے چند کے علاوہ کسی نے اس انسانی مسلہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

انسانی تاریخ میں جیلوں کا وجود ایک خاص مقام پر وجود میں آیا۔ یہ ایک طویل تاریخ ہے یہاں جگہ نہیں ہے کہ اس کی تفصیل میں جایا جائے۔

جیلوں کے اندر قیدیوں کے ساتھ خاص کر غریب اور لاوارث قیدیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے وہ ایک ناقابل بیان الگ داستان ہے۔

قانون کہتا ہے کہ ہر ڈسٹرک اینڈ سیشن جج ہر ماہ جیل کا دورہ کرے گا قیدیوں کی شکایات سنے گا اور ایسے قیدیوں کو ضمانت پر رہا کردے گا جنہوں معمولی جرم کیا ہو اور ان کا مقدمہ چل رہا ہو۔ اس کے علاوہ غیر سرکاری وزیڑز بھی ہوتے تھے۔

ایک زمانے میں مجسٹریٹ چھوٹے موٹے جرائم میں خود ہی شخصی ضمانت پر ملزم کی رہائی کا حکم دے دیتے تھے یا چھوٹا موٹا جرمانہ کرکے یا اچھے کردار کے ضمانت لے کر ملزم کو رہا کردیتے تھے۔

قانون کے مطابق ہر جیل میں ایک میڈیکل ڈاکٹر اور ابتدائی قسم کا ہسپتال ہونا چاہیے۔

مگر وزیر موصوف کے بیان کی مطابق تقریباً پچاس فی صد جیلوں میں خاطر خواطچی سہولیتیں میسر نہیں ہیں۔

ایک طرف قانون ہے اور دوسری طرف سماجی رویے ہیں۔ پاکستان کے سپریم کورٹ نے اپنے ک ءفیصلوں میں یہ لکھا ہے Bail cannot be withheld as a punishment۔ مگر اس کے باوجود عدالتوں سے ضمانت حاصل کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ دوسری طرف عوام کا یہ رویہ ہے کہ وکیل صاحب کسی طور پر ملزم، مخالف کی ضمانت نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ بات واضح ہے کہ حکومت قیدیوں پر کروڑوں روپیہ خرچ کرتی ہے۔ اگر ایسے قیدی جن کا مقدمہ زیر سماعت ہے اور جنہوں نے کوئی بہت سنگین جرم نہ کیا ہو ان کی فوراً ضمانت لے لی جائے۔ اس سے قومی خزانے کا بہت فائدہ ہوگا اور عام آدمی بہت ساری مشکلات سے بچ جائے گا۔

یہاں میں جنرل ضیاالحق کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کے دور میں یہ قانون بنا تھا کہ اگر کسی بھی مقدمہ کا فیصلہ دو سال تک نہ ہو تو ملزم ضمانت کا حقدار بن جاتا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم انصاف کے نظام کو جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق انسان دوست بنائیں—اور جیل ریفارم کریں۔

(بشکریہ روزنامہ مشرق)

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/ اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کرکے بذریعہ ڈاک روانہ کرسکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کرکے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جاسکے۔

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

لڑکی کو تعلیم دینا قوم کو تعلیم دینے کے مترادف ہے

محمد آصف نور

تمام افراد کے لیے عالمگیر، جامع، مساوی اور شمولیتی تعلیم پائیدار ترقی کا ایک انتہائی اہم ہدف ہے۔ اس چیز پر نا قابل تردید اتفاق رائے ہیکہ عالمی و قومی سطح پر تمام افراد کو مساوی و معیاری تعلیم اور استعداد سازی کے مواقع کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے اور اسے کسی بھی قوم کی پائیدار نمو اور ترقی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا بھر میں اس بات کو یقینی بنانے کی اجتماعی کوششیں کی جارہی ہیں کہ 2023 تک دنیا کی تمام لڑکیاں اور لڑکے مفت، مساوی اور معیاری پرائمری و سیکنڈری تعلیم حاصل کرلیں جس سے بلاشبہ ضروری اور مؤثر لرننگ آؤٹ کم کی راہ ہموار ہوگی۔ اگر کوئی بھی ملک یہ ہدف حاصل کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہاں لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے تمام فریقین اجتماعی جدوجہد کریں۔ نوعمر لڑکی کو تعلیم دینا ایک خاندان کو تعلیم دینے کے مترادف ہے۔ کوئی قوم صرف تعلیم کے ذریعے ہی معیار زندگی اور عورتوں کی خودمختاری کو فروغ دے سکتی ہے اور دنیا میں انتہا پسندی، غربت، موسمیاتی تبدیلی اور عدم مساوات کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ پاکستان کی اپنی منفرد مشکلات ہیں اور بدقسمتی سے اس کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جو مؤثر اور معیاری تعلیم کے لحاظ سے بدترین حالات کا شکار ہیں۔ پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 25۔ الف تمام افراد کو تعلیم تک رسائی کے حق کی ضمانت دیتا ہے۔ آئینی دفعات کے باوجود، تقریباً اڑھائی کروڑ بچے اب بھی سکول نہیں جاتے جن میں سے 55 فیصد لڑکیاں ہیں۔

پاکستان میں ایسی مشکلات کی کئی پرتیں ہیں جو کسی بھی لڑکی کے مفت و لازمی تعلیم کے حق سے مستفید ہونے کی صلاحیت اور موقع پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ایسی کمیونٹیوں میں والدین کے سماجی و ثقافتی رویے ہیں جہاں لڑکیوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، اور مضبوط پدرسری نظام میں ان کی تعلیم کو قابل قدر نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کو قابل ترجیح نہیں سمجھا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا مجموعی ڈھانچہ کئی لحاظ سے صنفی تعصب پر مبنی ہے اور اسے سرایت پزیر دقیانوسی خیالات، سماجی رسوم و رواجات کی حمایت حاصل ہے جس کے باعث لڑکیوں کے خلاف امتیاز کو مزید تقویت ملتی ہے۔

دوسرا مسئلہ تعلیمی اخراجات کا ہے۔ ناکافی سرکاری تعلیمی بجٹ، شفافیت اور جوابدہی کا فقدان بھی تعلیم اور شرح خواندگی میں کمی کا سبب ہے۔ یونیسکو نے سفارش کی تھی کہ قومی بجٹ کا کم از کم 20 فیصد (اور۔ یا جی ڈی پی کا چھ فیصد) تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ مجموعی طور پر، کم آمدنی والے ملکوں میں ریاستی آمدنی کا صرف 17 فیصد (یا جی ڈی پی کا 3.7 فیصد) خرچ ہوتا ہے۔ پاکستان میں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ تعلیم پر سرکاری خرچ جی ڈی پی کے 2.5 فیصد سے کم ہے جو کہ جی ڈی پی کے 7 فیصد جس کا قومی تعلیمی پالیسی میں عہد کیا گیا تھا، سے کم ہے۔ مزید یہ کہ صنفی تفاوت منصوبہ بندی اور بجٹ سازی میں بھی نظر آتی ہے۔ مناسب وسائل کی تخصیص میں ناکامی سے سرکاری تعلیم پر لوگوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے جس کے باعث تعلیم کی نجکاری کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ نجی تعلیم مہنگی اور لوگوں کی استطاعت سے باہر ہے اور یہ معاشرے میں ناہمواریوں کو جنم دیتی ہے۔ مشکلات کی ان مختلف انواع سے نبٹنے کے لیکیئے ملکی و عالمی تنظیمیں کام کررہی ہیں جو مؤثر تعلیمی پالیساں وضع کرنے کے حوالے سے حکومت کو سفارشات پیش کرتی اور اس کی مدد کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک معروف تنظیم ہیومن ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن (ایچ ڈی ایف) ہے جو علم کی غربت پر کام کررہی ہے۔ ایچ ڈی ایف تمام افراد کے لیے مساوی و معیاری تعلیم کے لیے کوشاں ہے تاکہ تمام بچے خاص کر لڑکیاں اپنی تمام صلاحیتوں کا ادراک کرسکیں۔ ایچ ڈی ایف مقامی اقدار اور ثقافت کو مدنظر رکھتے ہوئے صنفی مساوات اور کمیونٹی کی شمولیت کے لیے سرگرم عمل ہے۔ والدین، اساتذہ ایسوسی ایشن (پی ٹی ایز) کو کمیونٹی کی شمولیت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور والدین کو اپنے بچوں کی تعلیم کے عمل میں شریک کرتی ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں آکسفیم نے ایچ ڈی ایف کے تعاون سے سول سوسائٹی کی دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں ایک اجتماعی مہم چلائی ہے، پالیسی سازی اور اس کے نفاذ، دونوں سطحوں پر۔ اس اجتماعی سوچ کی بنیاد اتحاد سازی، مہم سازی، اور شہادت اکٹھا کرنے پر ہے تاکہ وسائل کی بہتر اور مساوی تقسیم کے لیے جدوجہد کی جاسکے۔

ایچ ڈی ایف نے حالیہ برسوں میں شہریوں کو عملی سرگرمیوں کا حصہ بنانے کے لیے نہ صرف آکسفیم اور دیگر ساتھی تنظیموں کی مدد کی ہے بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کی حالت میں بھی بہتری لائی ہے۔ مطلوبہ آواز اور جوابدہی کو مضبوط بنانے اور والدین اور دیگر فریقین کو اپنی بچیوں کو سکول بھیجنے پر آمادہ کرنیاور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مزید وسائل دینے کے لیے اداروں کو قائل کرنے کے عمل میں مدد کی گئی۔ اسی طرح، یہ کوشش بھی کی گئی کہ بجٹ سازی کرتے وقت صنف کے عنصر کو مدنظر رکھا جائے اور تعلیمی نظام کے اندر منصوبہ بندی سیاسی قوت ارادی کے ذریعے ہو اور اس مقصد کے لیے پنجاب اور سندھ میں دو تعلیمی کوکس قائم کیے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سیاسی قوت ارادی پیدا کرنے اور پالیسی سازی کے اداروں میں بحث تیز کرنے کے لیے پالیسی بیپرز تیار کیے جاتے ہیں۔

ایچ ڈی ایف-آکسفم کے تجربے اور سرگرمیوں کی بنیاد پر، اس بات کے بلاشبہ خاطر خواہ شواہد موجود ہیں کہ تعلیم کے بحران پر قابو پانے کے کئی متبادل طریقے موجود ہیں، خاص کر پاکستان جیسے ملک میں جو انسانی ترقی کے لحاظ سے نچلے درجے میں شمار کیا جاتا ہے۔ چند اہم اقدامات میں ملکی وسائل کے بہتر انصرام کے ذریعے تعلیمی سرمائے میں اضافہ کرنا، بہتر تعلیمی منصوبہ بندی اور بجٹ کی تخصیص، بالخصوص صنف کے لحاظ سے حساس بجٹ کی تخصیص اور رجعت پسندانہ ٹیکس کی بجائے ٹیکس کا ترقی پسندانہ غریب حامی نظام شامل ہیں۔

تمام سطحوں پر جدید منصوبے اور شمولیت کی بدولت ان حکمت عملیوں کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی میں اضافہ کرنے میں مدد ملے گی جو طلباء، والدین، کمیونٹی کے اراکین کی استعداد میں اضافہ کرتی ہیں، تاکہ حکومتی عہدے داروں کو ترغیب دی جاسکے کہ وہ اپنی معیاری

تعلیم کی فراہمی کی ذمہ داری کو پورا کریں۔ ان اقدامات کے علاوہ، اسکولوں میں سہولیات کو بہتر بنانے اور اسکولوں میں داخلے کی شرح کو بڑھانے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ایک اقدام یہ ہوسکتا ہے کہ ان طلباء کو وظائف دیے جائیں جو تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ آکسفم جیسی بین الاقوامی تنظیمیں اس ماڈل کا تجربہ کرچکی ہیں جس سے نہ صرف اسکولوں میں داخلے کی شرح میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اسکول چھوڑنے کا تناسب بھی کم ہوا ہے۔ وظیفے اور اس سے جڑے فوائد کی بدولت طلباء کے والدین کے رویوں میں بھی تبدیلی آئی ہے اور وہ تعلیم کو پہلے سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں۔ چونکہ خاندانی معاملات میں ہر اقدام اور فیصلے کا تعلق معاشیات سے ہوتا ہے، اس لیے تعلیم کا تعلق بھی ہنر میں اضافے کے پروگرام سے جوڑنا ہوگا۔ اس سے نہ صرف معاشی مواقع میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے خواتین بھی اس قابل ہوسکیں گی کہ وہ گھریلو اخراجات کا انصرام کرسکیں اور اس میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔ اس سے خواتین گھریلو معاملات میں اپنے رائے دینے کے بھی قابل ہوسکیں گی، اور یوں وہ اپنی بیٹیوں کو اس بات کا اختیار دے سکیں گی اور ان کی حمایت کرسکیں گی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ اس سے خاندانوں میں استحکام اور خوشحالی آئے گی۔ اگر ان خواتین کو اپنی آمدن کے مواقع میں اضافہ کرنے والی سرگرمیوں کے حوالے سے مالی اداروں اور مقامی منڈی کے کرداروں سے منسلک کیا جائے تو وہ اپنے ہنر، مصنوعات اور خدمات کے ذریعے ملک کی مجموعی معاشی بہبود میں بہت بڑا کردار ادا کرسکتی ہیں۔

پاکستان میں مقامی سطح پر لڑکیوں کی تعلیم کو درپیش مختلف قسم کی مشکلات میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، اور حکومت کی بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ شراکت داری اور مقامی حکومت کے ساتھ گہرے روابط اس مسئلے کے حل کی کنجی ہیں۔ بااختیار خواتین تعلیم کی داعی اور ممکنہ طور پر مستقبل کی قائد بن جاتی ہیں۔ اپنے حقوق سے آگاہی حاصل کرکے، وہ اپنی اجتماعی زندگیوں کے مستقبل کی راہ متعین کرسکتی ہیں۔ تعلیم کے لوازمات جن میں دستیابی، رسائی، قبولیت اور موافقت شامل ہیں، صرف اس وقت حاصل ہوسکتے ہیں جب مقامی، ضلعی، قومی اور بین الاقوامی شراکت دار آپس میں اشتراک کریں اور تمام سطحوں پر جوابدہی کا مضبوط نظام موجود ہو۔ رجائیت اور عاجزانہ اقدامات اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اشتراک کی بدولت معاشرے کی ذہنیت تبدیل کرنے اور کمیونٹی اور ادارتی سطح پر صنفی عدم مساوات کے حوالے سے دائمی ترقی دیکھنے کو ملے گی۔

(مصنف ادارہ برائے امن وسفارتی علوم کے ڈائریکٹر ہیں)۔

جاؤ اسے ڈیجیٹل زندان میں ڈال دو

وسعت اللہ خان

جس طرح ہر بچے کے ذہن میں اللہ میاں یا بھگوان کی اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر ہوتی ہے اسی طرح مجھے ریاست ہمیشہ کچھ نہ کچھ آڑی ترچھی، مثبت منفی، ٹیڑھی سیدھی، بنتی بگڑتی شے لگتی ہی رہتی ہے۔

مثلاً ان دنوں بات بے بات ٹیکس لگانے اور نت نئے شعبوں سے ٹیکس نچوڑنے کے لیے ریاست جس طرح کوشاں ہے۔ اور اس حقیقت سے بالکل آنکھیں موندے ہوئے ہے کہ ہر گائے کا مطلب محض دودھ دوہنا نہیں ہوتا۔ کچھ گائیں تعلیمی، تجرباتی، افزائشی و لحمیاتی تقاضوں کے تحت بھی پالی جاتی ہیں۔

مگر ان دنوں تخلیقی اُپچ سے عاری بلا امتیاز ندیدے پن کا شکار ریاست مجھے ماسٹر سبطین جیسی لگ رہی ہے جو آدھی چھٹی کے وقت کھانا چکھنے کے بہانے ہر بچے کے ٹفن میں سے کچھ نہ کچھ کھا مرتے اور بچے مارے ادب یا خوف پیٹ بھرنے سے محروم رہتے۔ یا مختلف ریاستی ادارے مجھے وہ مسٹنڈے دادے نظر آ رہے ہیں جو کہیں بھی ناکا لگا کر یا سڑک پر بانس اڑا کر کے یا کسی بھی پارکنگ لاٹ میں چار لمڈے بھیج کر فیس، ٹیکس یا پرچی پہ بھتہ وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جب ان اداروں، افراد یا داداؤں سے کوئی پوچھے کہ بھیا یہ سب کس قانون کے تحت ہو رہا ہے، ہمیں بھی کوئی تحریری نقل دکھاؤ تو یہ سننے کو ملتا ہے کہ ابے تو کیا ہم سے زیادہ قانون جانتا ہے؟ ہمیں یہاں صاحب نے وصولی کے لیے کھڑا کیا ہے، تیرے کو زیادہ تکلیف ہے تو ہمارے صاحب سے پوچھ لینا شام کو آئیں گے۔ فی الحال پیسے نکال اور یہ پکڑ پرچی۔

اور جب کوئی عام آدمی یہ کہتے ہوئے بھڑ جائے کہ ہم پیسے نہیں دیں گے یا ہم اس جگہ سے نہیں اٹھیں گے جب تک کسی کا تحریری حکم نہیں دکھاتے تو پھر ہاتھا پائی، گالم گلوچ یا اس سے بھی کام نہ چلے تو نامعلوم افراد کی مدعیت میں بغاوت یا دہشت گردی کی دفعات ڈال کر مقدمات درج ہونے شروع ہو جاتے ہیں، یا نامعلوم افراد اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔

حالت اب یہ ہے کہ ریاستی اداروں کی اکائی نہیں رہی بلکہ ہر ادارہ بطور ریاست ایک علیحدہ شناخت کی دعوے داری کے ساتھ اپنی اپنی من مانی اور سینہ زوری پر اتر آیا ہے۔

ریاستی اختیار کے کاؤنٹر پر جو اہل کار پالیسی سازوں جیسا لباس پہنا کر بیٹھا دیے گئے ہیں وہ دراصل اسی کاؤنٹر کے پچھلے کمرے میں بیٹھے بااختیاروں کی صوابدید پر ریاستی عمل داروں کی ادا کاری کرنے معززین کے

امید تھی کہ اب جبکہ روائتی میڈیا حسبِ منشا لم لیٹ ہو گیا ہے تو پیمرا کو چابی بھرنے والوں کو کچھ عرصے کے لیے آرام مل جائے گا۔ مگر جن ناپسندیدہ چہروں کا عرصہِ حیات تنگ کر کے انہیں الیکٹرونک میڈیا کے قبیلے سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور انہوں نے پھر سوشل میڈیا کی غیر لیز شدہ زمین پر گفتگو کی جھونپڑیاں ڈالنے کی کوشش کی تو کسی نے پیمرا کو مشورہ دیا کہ سوشل میڈیا کا رقبہ بھی تو ریاست کی حدود میں ہے لہذا اس پر بھی ریاست کا محصولاتی وسٹرٹیجک اختیار ہونا چاہئے۔

روپ میں عام سے کارندے ہیں۔

اس طرح سے ریاست چلانے کی جانب کسی کی توجہ نہ جائے۔ اسے یقینی بنانے کے لیے الیکٹرونک میڈیا کے چوکیدار ادارے پیمرا نے بہت عرصہ پہلے ہی لائسنس یافتہ میڈیا کو اداراتی زنبور سے آختہ کر کے نیز سارے ڈنک اور دانت نکال کرا سے اس سطح پر لا کے چھوڑ دیا کہ میڈیا پھنکار سکتا ہے، خوخیا سکتا ہے، مگر بھونک سکتا ہے نہ کاٹ سکتا ہے۔

آج کا میڈیا دیکھنے میں بھی بطخ ہے، تیرتا بھی بطخ کی طرح ہے، کوینک کوینک کی آواز بھی نکالتا ہے مگر یہ بطخ نہیں بطخ نما ہے جسے مصنوعی ذہانت کے آلے کی مدد سے تیرایا جا رہا ہے۔

امید تھی کہ اب جبکہ روائتی میڈیا حسبِ منشا لم لیٹ ہو گیا ہے تو پیمرا کو چابی بھرنے والوں کو کچھ عرصے کے لیے آرام مل جائے گا۔ مگر جن ناپسندیدہ چہروں کا عرصہِ حیات تنگ کر کے انہیں الیکٹرونک میڈیا کے قبیلے سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور انہوں نے پھر سوشل میڈیا کی غیر لیز شدہ زمین پر گفتگو کی جھونپڑیاں ڈالنے کی کوشش کی تو کسی نے پیمرا کو مشورہ دیا کہ سوشل میڈیا کا رقبہ بھی تو ریاست کی حدود میں ہے لہذا اس پر بھی ریاست کا محصولاتی وسٹرٹیجک اختیار ہونا چاہئے۔

چنانچہ اب اگر الیکٹرونک میڈیا کے کسی پناہ گزین کو سوشل میڈیا کی کچی آبادی پر اپنا نشریاتی خیمہ، ویب ٹی وی یا ویب چینل کی شکل میں گاڑنا ہے تو اسے پیمرا سے لائسنس خریدنا ہوگا۔ ویب پر خبری چینل کے لائسنس کی فیس ایک کروڑ روپے اور غیر خبری چینل کی فیس پچاس لاکھ روپے ہوگی۔

اب اگر کوئی پیمرا سے پوچھے کہ بھائی انٹرنیٹ تو بین الاقوامی ملکیت ہے اور اس کا استعمال اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کونسل نے بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ آپ کیسے کسی سے انٹرنیٹ پر خیمہ لگانے کی فیس وصول کر سکتے ہیں؟

اس سوال کا بھلے پیمرا کے پاس کوئی معقول تحریری جواب ہو کہ نہ ہو لیکن جب ایسے ٹیڑھے سوال اٹھانے والا اٹھ جائے یا اس پر کوئی نامعلوم یا غیر معروف شہری بغاوت یا ملک دشمنی یا کارِ سرکار میں مداخلت کا پرچہ کٹوائے گا تو لگ پتہ جائے گا کہ کس قانون کے تحت کسی قانونی سوال کو اٹھانے کی بدتمیزی کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

جب آپ کو وفاقی کابینہ، پارلیمانی پھرتیوں اور ٹاک شوز کی شکل میں بوریت دور کرنے کے اسباب فراہم کر دیئے گئے ہیں تو آپ ان میں من لگانے کے بجائے کارِ سرکارِ نادیدہ میں ٹانگ اڑانے پر کیوں بضد ہیں۔

آپ جیسے پاگلوں کا ایک ہی علاج ہے کہ آپ کو ڈیجیٹل زندانوں کی دیدہ و نادیدہ سلاخوں کے پیچھے ڈال کے بھول جایا جائے۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

پاکستان کنفیوژن میں ہے کیونکہ پیدا ہی کنفیوژن میں ہوا

اقوام متحدہ میں پاکستان کی سابق مستقل مندوب اور امریکہ میں سابق پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی کا کہنا ہے کہ پاکستان کی سفارت کاری 'بورنگ ڈپلومیسی' ہے، جبکہ آج کے دور میں سافٹ ڈپلومیسی کامیاب ہے۔

کراچی میں جمعے کو دوسرے ادبی میلے کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ملیحہ لودھی کا کہنا تھا کہ معاشی اور عسکری سفارت کاری سافٹ پارٹ نہیں ہے، پاکستان کو برانڈنگ کی ضرورت ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ دنیا کو پاکستان کی موسیقی، آرٹ، اور فلم سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے اور دفترِ خارجہ اور اس کے ساتھ کام کرنے والے اسلام آباد سے باہر نکل کر دیکھیں کہ ملک کے پاس کیا میوزک، کاریگر اور فنکار ہیں، دنیا میں اس کو دکھانے کی ضرورت ہے۔

'اقوام متحدہ گلوبل سٹیج ہے جہاں پاکستان کے آرٹ اور فن کی کوئی نمائش نہیں ہوئی، میں نے راحت فتح علی خان کو بلایا اور اللہ ہو کی فرمائش کی۔ ہال میں اللہ ہو کی آواز گونجنے لگی۔ وہ اہم وقت تھا ہم انسانی حقوق کونسل کی رکنیت کا انتخاب لڑ رہا تھے، کشمیر کی وجہ سے یہ منصب اہم تھا، اس محفل کے بعد ہم وہ انتخاب جیت گئے۔ میں نے راحت کو میسج کیا کہ اس کامیابی میں آپ کا اہم کردار ہے۔'

'دنیا آرٹ و کلچر سے قوموں کو پہچانتی ہے'

ملیحہ لودھی کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کے 190 ارکین میں سے 55 افریقہ کے ممالک ہیں، 37 چھوٹے جزائر والے ملک ہیں اور 12 لاطینی امریکہ کے ملک ہیں، جنھیں ہمیں بتانے کی ضرورت ہے کہ ہم قدیم تہذیب ہیں۔

'ہم نے فلم فیسٹیول منعقد کیا، کئی سفیروں نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کے پاس فلم انڈسٹری ہے، اسی طرح آرٹ کی نمائش کی جس میں سیکریٹری آئے اور خطاطی کے سامنے آ کر رک گئے اور کہا کہ میں نے تو سمجھا تھا کہ پاکستان صرف یہ ہی کرتا ہے۔'

ملیحہ لودھی نے بینظیر بھٹو کے دور کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اُن دنوں وہ امریکہ میں سفیر تھیں ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے امریکہ کی پابندیاں عائد تھیں، بینظیر بھٹو نے صدر کلنٹن سے کہا کہ رعایت دی جائے اور ہم نے جو ایف 16 طیاروں کی ادائیگی کی ہے وہ دے دیے جائیں، ان دنوں کلنٹن کا زور نہیں تھا کیونکہ سینیٹ اور ایوانِ نمائندگان میں ریپبلکن پارٹی کی اکثریت تھی، ہم پبلک ڈپلومیسی کے ذریعے یہ گول حاصل کر سکتے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ ہم نے کانگریس کے ممبران سے ملاقات کی، پریشر گروپس اور صحافیوں سے بات کی اور ہمیں کامیابی حاصل ہوئی۔

کراچی میں یہ دوسرا ادب فیسٹیول ہے، جس کے روح رواں امینہ سید اور آصف فرخی ہیں۔ اس سے پہلے امینہ سید آکسفورڈ پریس سے وابستہ تھیں۔

افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے امینہ سید کا کہنا تھا کہ 2010 میں انھوں نے ادبی میلے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اب کراچی سمیت متعدد علاقوں میں یہ ادبی میلے پھیل چکے ہیں۔

دوسرے ادبی میلے کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اس میں کریئیٹو رائٹنگ ورکشاپ اور انٹریکٹیو سیشن رکھے گئے ہیں، اس کے علاوہ ادبی ٹورز کا انتظام بھی کیا ہے، جس میں کراچی کے وہ مقامات جن کا ذکر کہانیوں اور افسانوں میں ملتا ہے یا جہاں ادیبوں نے قیام کیا یا وقت گزارا، ان کی سیر کرائی جائے گی۔

آصف فرخی کا کہنا تھا یہ ادبی میلہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب کتابوں کی رونمائی نہیں ہونے دی جا رہی، ناشروں کے دفاتر سے کتابیں اٹھائی جاتی ہیں اور فلموں کی نمائش کی اجازت نہیں دی جاتی۔

'ان قدامات سے شدت پسندی بڑھے گی، ادب اس کی روک تھام میں دیوار کا کردار ادا کر سکتا ہے۔'

سابق چیف جسٹس آصف سعید کھوسہ نے بھی افتتاحی تقریب سے خطاب کیا اور عدالتی فیصلوں میں ادبی حوالوں اور شاعری کی روایت پر روشنی ڈالی۔

ان کا کہنا تھا کہ ادبی دلائل قانونی دلائل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بات جو ویسے نہیں کہی جا سکتی وہ شاعری کے ذریعے کہہ دی جاتی ہے۔

ادب فیسٹیول کے پہلے روز 6 موضوعات پر بحث مباحثے کیے گئے، جن میں خواتین پر تشدد، طلبہ یونین کی بحالی، پاکستانی بیانیے کی ختم نہ ہونے والی لڑائی شامل تھی جبکہ عمر شاہد حامد کی کتاب 'دے فکس' پر ان کے ساتھ نشست کی گئی۔

پاکستانی بیانیہ کی ختم نہ ہونے والی لڑائی پر بات کرتے ہوئے سابق سفیر نجم الدین شیخ کا کہنا تھا کہ قیام پاکستان کا خیال واضح تھا کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کا ملک ہوگا جہاں انھیں معاشی آزادی ہوگی وہ اپنا طرز زندگی برقرار رکھ سکیں گے۔

'مسلم لیگ کا ڈھاکہ میں جو پہلا اجلاس ہوا اس میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ برطانیہ جا رہا ہے۔ مسلمان جو آبادی کا صرف 25 فیصد ہیں، ان پر ہندو اپنا ایجنڈا اور خواہشات مسلط کریں گے وہ اپنا طرزِ زندگی کیسے برقرار رکھ سکیں گے۔ قائداعظم جو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے پاکستان کے بانی بن گئے، صرف اس لیے کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ ایک یہ ایسا راستہ ہے جس سے مسلمان وطن حاصل کر سکتے ہیں اور معاشی اور سیاسی طور پر آزاد ہوں سکیں گے۔'

نجم الدین شیخ کا مزید کہنا تھا کہ قائد اپنی سوچ میں بلکل واضح تھے کہ وہ مسلم ریاست کے بارے میں بات نہیں کر رہے تھے بلکہ ایسی ریاست جس میں لوگ اپنی زندگی آزادی سے گزاریں وہ مندر اور مسجد میں جا سکیں کیونکہ مذہب ریاست کا مسئلہ نہیں ہوگا۔

پروفیسر پرویز ہود بھائی نے نجم الدین شیخ سے اختلاف کیا اور کہا کہ پاکستان ایک کنفیوژن کی صورتحال میں ہے کیونکہ اس کی پیدائش بھی کنفیوژن میں ہی ہوئی تھی۔ 'پاکستان کی بنیاد جو محمد علی جناح نے بیان کیں کہ برصغیر میں دو قومیں رہتی ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں وہ کبھی بھی امن کے ساتھ نہیں رہ سکتیں، دوسرا حصہ یہ تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ پہلے موقف سے نریندر مودی کو پاور ملی۔ مذہبوں میں کشیدگی

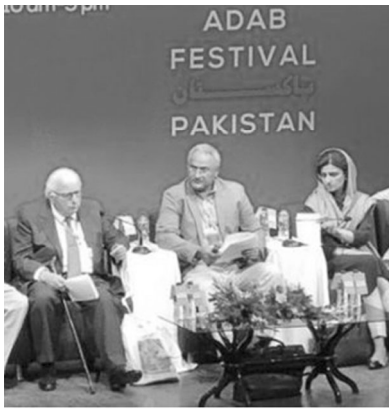

رہتی ہے اور ہندو مسلم میں خصوصی کشیدگی ہے تاہم جناح کی دوسری بات کافی غیر حقیقت پسندانہ ہے، سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان ایک قوم بن سکتے ہیں اور پرامن رہ سکتے ہیں تو پھر بنگلادیش کیوں بنتا؟'

پرویز ہود بھائی کا کہنا تھا کہ پاکستان کے بیانیہ میں بنگلادیش پر بات نہیں کی جاتی۔

'ہم نے بنگالیوں کے ساتھ برا سلوک کیا ہم نے انھیں کمتر تصور کیا، ہم نے پہلے ان کا استعمال کیا اور پھر ان کا قتل عام کیا، اگر تمام مسلمان پرامن طریقے سے رہ سکتے ہیں تو بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک نہ ہوتی اور منظور پشتین گرفتار نہیں ہوتا۔'

پرویز ہود بھائی نے نجم الدین شیخ سے مخاطب ہو کر کہا کہ محمد علی جناح پاکستان کے بانی ہیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کیا ہو گا؟ انھوں نے کبھی کوئی ریسرچ پیپر نہیں لکھا، کوئی ایک مضمون تحریر نہیں کیا۔ انہوں نے متعدد تقاریر کیں جن میں مختلف اوقات پر مختلف باتیں کہیں۔ '11 اگست 1947 میں فرنٹیئر میں خطاب کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ تم پہلے مسلمان ہو پھر انڈین ہو، 1948 کو کراچی میں بار کاؤنسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا اس زمین پر اسلامی قانون ہوگا۔

'دراصل انھیں پاکستان کا آئیڈیا نہیں تھا۔ 1945 میں جب مولانا مدنی نے ان سے پوچھا کہ پاکستان کیا ہوگا؟ تو انھوں نے جواب دیا فکر نہ کریں ہمارے پاس بہت وقت ہے ہم پاکستان حاصل کر لیں پھر دیکھ لیں گے کہ کیا نظام ہوگا۔'

پرویز ہود بھائی کے مطابق محمد علی جناح کے پاس ایسا کوئی پروگرام نہ تھا کہ جاگیرداری سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں گے، پاکستان فیڈریشن ہوگ ایا کنفیڈریشن، سائنس ٹیکنالوجی میں کیا ہوگا، اس کا کوئی پلان نہ تھا۔ 'کنفیوژن اور بھی گہرا ہو گئی جب دو قومی نظریہ 1971 میں خلیج بنگال میں بہہ گیا، اس کو وہاں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا، ہمیں کسی نظریے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک نظریے کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ ہالینڈ اور جاپان کے پاس کوئی نظریہ نہیں، بنگلادیش کی مثال لے لیں۔ ہمیں نارمل ملک ہونا چاہیے اور نارمل ملک اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں، یہ ملک افواج پاکستان کے لیے نہیں عوام کے لیے بنا تھا۔'

(بشکریہ بی بی سی اردو)

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے، جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

Human Rights Commission of Pakistan
جہد حق
Monthly JEHD-E-HAQ

14 جنوری 2020، اسلام آباد: آئینی نظام اور انسانی حقوق پر سیمینار

یکم فروری 2020، لاہور: ایچ آر سی پی نے طالب علموں کو متحرک کرنے کے لیے اجلاس کا انعقاد کیا

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15